ڈاکٹر فرحت یاسمین

پروین شاکر
فکر و فن

پروین شاکر

فکر و فن

پروین شاکر

فکر و فن

ڈاکٹر فرحت یاسمین

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

PERWEEN SHAKIR—FIKR-O-FUN

by

Dr. Farhat Yasmin

Year of Edition 2013
ISBN 978-93-5073-327-1
₹ 119/-

نام کتاب : پروین شاکر — فکروفن

مولفہ وناشر : ڈاکٹر فرحت یاسمین

سنِ اشاعت : ۲۰۱۳ء

قیمت : ۱۱۹روپے

صفحات : ۲۰۸

تعداد اشاعت : ۵۰۰

کمپوزنگ : ڈی ٹی پی کمپیوٹرس، کاظمی بیگم کمپاؤنڈ
گذری، پٹنہ سیٹی ۔۸۰۰۰۰۸

مطبع : عفیف پرنٹرس، دہلی ۔٦

ملنے کے پتے :

۱۔ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۔۴
۲۔ آفتاب بک ڈپو، سبزی باغ، پٹنہ ۔۴
۳۔ کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۔۴

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

والد مرحوم

اور

والدہ محترمہ

کے نام

فہرست

☆☆

حرفِ آغاز

اردو شاعری کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہماری چار سو سال کی شعری روایات میں خواتین کی حصہ داری ہمیشہ سے رہی ہے۔ شہزادی زیب النساء سے لے کر بیگم بھوپال تک کئی نام ہیں جن کے تذکرے جا بجا ملتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مشرقی آداب و اطوار کے زیر اثر عام طور پر خواتین کو شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ سے الگ رکھا جاتا تھا۔ لیکن خواتین نے زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی انفرادیت کا احساس دلایا ہے۔

عہدِ حاضر کی شاعرات میں ''ساجدہ زیدی''، ''زاہدہ زیدی''، ''عذرا زیدی''، ''سارہ شگفتہ''، ''میمونہ روحی''، ''کشور ناہید''، ''فہمیدہ ریاض'' جیسے ناموں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جنہوں نے اپنے مختلف شعری رویوں اور نسائی لہجوں سے پوری طرح متوجہ کیا اور اردو شاعری میں ایک نئی توانائی کا احساس دلایا۔

ستاروں کی مانند جگمگاتی شاعرات کے اس جھرمٹ میں پروین شاکر ایک ایسا نام ہے جس نے اپنے نئے تجربوں اور شعری رویوں کے ساتھ نہ صرف چونکایا بلکہ

ایک قطب تارے کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئیں۔

پروین شاکرؔ کی بے پناہ مقبولیت کی پہلی سطح تو غزل ہے، جہاں پروین شاکرؔ ایک نئے لب و لہجے کی دریافت کے عمل سے گزرتی نظر آتی ہیں۔ صنائی لفظوں اور گلابی تشبیہوں سے سجے لب آشنا غزل کے مصرعے اُردو شاعری میں سرسبز خیالات کے گلستان سجاتے ہیں، جہاں نغموں کی پھوہار ایک عجیب سی شگفتگی اور سرشاری کا احساس دلاتی ہے؛ چنانچہ اُن کے پہلے شعری مجموعے ''خوشبو'' کو پڑھتے ہوئے بے ساختہ یہ احساس ہوتا ہے:

حرف تازہ نئی خوشبو میں لکھا چاہتا ہے
باب اِک اور محبت کا کھلا چاہتا ہے

پروین شاکرؔ نے محبت کے تجربے کو اپنی رگ و پے میں محسوس کیا اور اُس کی مختلف حسیاتی اور نفسیاتی کیفیتوں کو ایک عورت کے تمام تر انفرادی اور اجتماعی شعور اور لاشعور کے ساتھ اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے۔

بلاشبہ غزل اور نظم اُن کے تخلیقی تجربے کا ایک جزو ہیں، جہاں حسیاتی تجربے کی ایک وسیع دنیا اور لفظیات کا ایک منفرد روپ نظر آتا ہے۔ غزل میں اُن کی شاعری جہاں ''خوشبو'' بکھیرتی ہے وہیں نظموں میں ''صد برگ'' قدرت کے مناظر کا احساس دلاتی ہے۔ ''کہیں خود کلامی'' ہے تو کہیں ''انکار''۔ اور شاید اسی اعتبار سے انہوں نے اپنے شعری مجموعوں کا نام رکھا ہے۔

اُن کی شاعری کا سفر جو 1970ء کے آس پاس شروع ہوا، اچانک 25 دسمبر 1994ء کو تمام ہوگیا۔ اور تب اُن کی تمام شعری کائنات کو ''ماہِ تمام'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ اُردو شاعری کا یہ ماہِ تمام آسمانِ ادب سے اچانک اوجھل ہوگیا؛ لیکن اُس کی یاد کا چاند ہمارے ذہنوں میں آج بھی جگمگا رہا ہے اور اُس کے شعروں کی روشنی آج بھی ہمارے دلوں کو روشن کر رہی ہے۔ اس نے خود بھی کہا تھا:

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے

لفظ میرے مرے ہونے کی گواہی دیں گے

میں جب ایم۔ اے کی طالبہ تھی اس وقت پروین شاکر کے انتقال کی خبریں ادبی رسالوں میں آئیں۔ پھر ''شاعر''، ''آج کل'' اور کئی دیگر رسالوں میں پروین شاکر کی شخصیت اور فن کے تعلق سے خصوصی گوشوں کی اشاعت اور مضامین کا سلسلہ شروع ہوا، جنہیں پڑھتے ہوئے میں پہلی بار پروین شاکر سے نہ صرف متعارف ہوئی؛ بلکہ متاثر بھی ہوئی اور اسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال جنم لینے لگا تھا کہ میں بھی اُن کی زندگی اور شاعری سے متعلق ایک کتاب لکھوں گی۔ اُن سے متاثر ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی رہی ہے کہ پروین شاکر پیدا تو ہوئیں پاکستان میں اور اُن کی شاعری بھی پاکستان میں ہی پروان چڑھی؛ لیکن ہندوستان کی کئی زبانوں میں اُن کی شاعری کی گونج سنائی دی۔ اُن کے شعر گھر گھر پہنچے خاص طور پر ہندی میں اُن کے پہلے شعری مجموعے ''خوشبو'' کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اس طرح پاکستان کی ہوتے ہوئے بھی

یہ شاعرہ ہندوستان کی بن گئیں۔ ویسے بھی آبائی طور پر اُن کا وطن ہندوستان ہی تھا۔ اُن کے والد کا تعلق صوبہ بہار کے ضلع شیخ پورہ سے تھا۔ وہ یہاں کے قصبہ حسین آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے سلسلے میں پٹنہ میں رہے اور آزادی سے پہلے کراچی چلے گئے۔ اور میرا تعلق بھی پٹنہ بہار سے ہے، ایسے میں میرے ذہن میں پروین شاکر نے جو مقام بنایا یہ کتاب اسی کا نتیجہ ہے۔

امید ہے یہ کتاب قارئین کو پسند آئے گی۔ میں ان سبھوں کی شکرگزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت وغیرہ میں میری مدد کی اور خاص کر اپنے اساتذہ کی تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کا شکریہ بھی ضروری ہے کہ اس کی مالی اعانت سے یہ کتاب منظر عام پر آسکی۔

فرحت یاسمین

پیش لفظ

مجھے خوشی ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں کئی خواتین خاصی سنجیدگی کے ساتھ اردو تنقید کی طرف متوجہ ہوئی ہیں اور انھوں نے مختلف النوع موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ فطری طور پر ان کی تحریریں موضوع سے متعلق عام مباحث کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے مخصوص اندازِ فکر (اگر کوئی ہے!) کی بھی آئینہ داری کرتی ہیں۔ ایسی ہی قلم کاروں میں ایک نام فرحت یاسمین کا بھی ہے، جن کے مضامین گاہے گاہے رسالوں میں دکھائی دیتے ہیں اور اب وہ ایک مکمل کتاب منظرعام پر لانے کا حوصلہ کررہی ہیں۔ میں سب سے پہلے تو ان کے حوصلے کی داد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ ان کی یہ کاوش کامیاب ہو؛ تاکہ دوسروں کے لیے بھی جرأتِ اظہار کا پہلو پیدا ہوسکے۔

جہاں تک کتاب کی افادیت کا تعلق ہے اس سے انکارنہیں کیا جاسکتا۔ اس کی بنیادی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ اس موضوع پر اس سے پہلے جو کچھ لکھا جاچکا ہے اس کا بیشتر حصہ مصنفہ کی نگاہ میں ہے، اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے طور پر بھی پروین شاکر کے فکروفن سے متعلق بعض نکات اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔

دراصل بڑے فنکاروں کے بارے میں چند باتیں تو عمومی طور پر کہہ دی جاتی ہیں اور اُن کی تکرار بھی ہوتی رہتی ہے، مگر ذہین قاری اپنے بطور مطالعے کی روشنی میں کچھ اور نتائج بھی برآمد کرسکتا ہے، ممکن ہے کہ اُن میں سے بعض نتائج فوری طور پر قابلِ قبول یا درست نہ معلوم ہوں؛ لیکن وہ غور وفکر کا ایک نیا زاویہ ضرور فراہم کرتے

ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پروین شاکر بھی ایک بڑی فنکارہ تھیں؛ اس لیے نہ صرف یہ کہ مختلف جہتوں سے اُن کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے؛ بلکہ ہر مطالعے کی روشنی میں ایک نئے پہلو بھی سامنے آسکتے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ بلاشبہ یہ احساس دلاتا ہے کہ فرحت یاسمین نے ایک محنتی اور ذہین طالبہ کی طرح پروین شاکر کی غزلوں اور نظموں کا خود اُن کی زندگی کے حوالے سے مطالعہ کیا ہے اور اپنے مطالعے کے نتائج سہل اور رواں زبان میں پیش کیے ہیں؛ اس لیے کتاب میں مصنفہ کے تنقیدی شعور کی جھلک بھی ہے اور Readability بھی، چونکہ یہ اُن کی پہلی تنقیدی کتاب ہے، اس لیے بھی اُن کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

پروفیسر اعجاز علی ارشد
پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

پروین شاکر: شخصیت اور شاعری

ریاست بہار کو یہ فخر حاصل ہے کہ پروین شاکر (پارہ) کا آبائی تعلق بہار کے علاقہ شیخ پورہ سے رہا ہے۔ یہ جگہ پہلے ''گیا'' ضلع میں تھی، اب شیخ پورہ خود ایک ضلع بن چکا ہے۔ پروین شاکر کی پیدائش ۲۴ر نومبر ۱۹۵۲ء میں کراچی میں ہوئی۔ ان کے والد سید شاکر حسین ثاقبؔ اپنی اعلیٰ تعلیم پٹنہ میں مکمل کرنے کے بعد ۱۹۴۶ء میں پاکستان کے قیام سے قبل ہی کراچی کا سفر اختیار کیا اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آپ سات بھائی سید منظور الحسین، سید جابر حسین، سید ناظر حسین، سید ناصر حسین، سید بابر حسین، سید نادر حسین اور دو بہنوں میں سب سے چھوٹے سید شاکر حسین ثاقب تھے۔ ثاقبؔ صاحب خود بھی شعر و شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر کہتے تھے تخلص ''ثاقبؔ'' تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی بہت سے انعام شعری مقابلوں میں حاصل کیے۔ ساتھ ہی کئی گولڈ میڈل بھی حاصل کیے۔ مگر ان کا کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ انہیں سماجی اور فلاحی خدمات میں زیادہ دلچسپی تھی۔ رضویہ سوسائٹی، امام بارگاہ، اسپتال اور اسکول کی تعمیر اور ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ پاکستان میں T.N.T میں ملازم تھے۔ ۱۹۸۴ء میں ملازمت سے سبکدوش

ہوئے۔ فروری ۱۹۹۲ء میں معمولی بیماری کے بعد انتقال فرما گئے۔اپنے والد کے انتقال کے وقت پروین شاکر ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ میں تھیں۔

پروین شاکر کی والدہ کا نام افضل النساء بیگم عرف منن تھا۔ ان کا میکہ پٹنہ میں تھا یہ سید کاظم حسین صاحب محلہ افضل پور کی صاحبزادی تھیں۔ پروین شاکر دو بہنیں تھیں۔نسرین شاکر، پروین شاکر۔

والد کے انتقال کے بعد دونوں بہنیں والدہ کے ہمراہ رہیں۔نسرین ہمیو پیتھ کی ڈاکٹر تھیں۔ وہ اپنے پیشے میں کافی مقبول رہیں۔ ان کا ادبی ذوق بھی بہت بالیدہ تھا۔کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتی تھیں۔مگر اپنا کلام منظر عام پر لانے سے گریز کرتی تھیں۔ چنانچہ ان کا تقریباً سارا کلام تلف ہو گیا۔نسرین ایک غم زدہ بلڈ کینسر کی مریضہ تھیں، شوہر سے ان کی علیحدگی ہو گئی تھی۔ انہیں کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔

پروین شاکر کی پیدائش، ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم یہ سب کراچی میں ہوئی۔ ان کی ذہانت وفطانت اور اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی کی اطلاعات دیکھئے۔ وہ اپنی کتاب ''سرگزشت پروین شاکر'' میں لکھتے ہیں:

> ''پروین شاکر بچپن سے ہی حسین، حساس اور ذہین وفطین تھیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم کیمبرج اسلامیہ، مشن رائزنگ اور زاہدہ تقی کے اسکول رضویہ گرلز سکنڈری اسکول سے ہوئی۔ جہاں سے انہوں نے ۱۹۶۶ء میں میٹرک پاس کیا۔ سرسید گرلز کالج سے انٹر کیا، ۱۹۶۸ء میں بی اے آنرز کیا۔ ۱۹۷۳ء میں انگریزی سے ایم اے کیا۔ اسی سال عبداللہ گرلز کالج میں

بطور انگریزی لیکچرر ان کی تقرری ہوئی اس کے بعد پھر انہوں نے لسانیات
میں ایم اے کیا۔"(۱)

عبداللہ گرلس کالج کراچی میں تدریس پر مامور ہوئیں۔ لیکن ان کے اونچے معیار اور طلبہ کی زوال آمادہ فہم کی وجہ سے استاد اور شاگردوں کا تال میل دشوار ہوگیا۔ ادھر سول سروس میں نمایاں کامیابی کی وجہ سے انہیں کسٹم ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت مل گئی۔ محکمہ میں ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچ گئیں۔

شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا اور گھر اور معاشرے نے اس شوق کو مزید مہمیز کیا۔ طبیعت میں حددرجہ سادگی تھی۔ بے ریائی، سلاست اور غیر مصنوعی انداز طبیعت نے پروین شاکر کی شاعری کو بھی تصنع سے پاک وصاف کیا اور راست اظہار کا ایک عمدہ نمونہ بنادیا۔ وہ شدید جذبے کے باوجود اظہار کی سطح پر نرم روی کا مظاہرہ کر کے شاعری میں اس مقام تک پہنچ گئیں جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

پروین شاکر کو شاعری کا ذوق وراثت میں ملا تھا۔ ان کے نانا ایک کامیاب شاعر تھے۔ وہ صوبہ بہار کے کاپریٹو ڈپارٹمنٹ سے منسلک تھے۔ ۱۹۴۵ء میں بحیثیت کاپریٹو سکریٹری ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں اپنی بیٹی کے پاس کراچی چلے گئے اور وہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔ پروین شاکر کا بچپن انہیں کی گود میں گزرا۔ لاشعوری طور پر ان کے اندر کی شاعرہ پروان چڑھتی رہی۔ وہ اپنے نانا کے کلام کا بغور مطالعہ کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ عنفوان شباب سے ہی شاعری کرنے لگیں۔ شروع

کے کلام میں والد کا رنگ سخن نمایاں تھا؛ لیکن آہستہ آہستہ پروین کا اپنا لہجہ مستحکم ہوتا گیا جس نے اردو شاعری میں ایک دلکش لہجے کی وجہ سے مقبولیت عام حاصل کی۔

ابتدا میں انہوں نے اپنا تخلص بینا رکھا۔ لیکن آگے چل کر تخلص کا سلسلہ ختم کر دیا اور اپنے نام کے ساتھ اپنے والد کی نسبت جوڑ کر پروین شاکر ہو گئیں۔ آگے چل کر اسی نام سے شعروادب میں مقبول ہوئیں۔

پروین شاکر کی شادی اگرچہ ان کے خالا زاد بھائی ڈاکٹر نصیر علی سے ۱۹۷۶ء میں ہوئی تھی۔ لیکن پے در پے اسباب ایسے پیدا ہوتے گئے کہ یہ رشتہ ناکام ثابت ہو گیا اور خالہ زاد بھائی کی محبت بھی یکا یک نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ پروین نے یہ عرصہ سخت ذہنی کوفت میں گزارا۔ غنیمت ہے کہ انہیں شاعری کا ملکہ حاصل تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی شخصیت کو ڈپریشن سے بچانے کے لیے اس مداوے کا سہارا لیا۔ اس دور کی محزونیت، اداسی، مایوسی اور اندر اندر گھلتے رہنے والی کیفیات سے ان کا تخلیقی لہجہ انفرادیت کا حامل ہو گیا۔ پروین شاکر کے قریبی حلقے کے کچھ افراد نے بھی ان کے خلاف کچھ ایسی افواہیں پھیلا دیں جن کی وجہ سے وہ کچھ دنوں تک بیمار رہیں۔ مختصر یہ کہ شادی طلاق کی منزل تک پہنچ گئی۔ ڈاکٹر نصیر سے انہیں ایک اولاد دیرینہ ہوئی۔ جس کا نام مراد رکھا۔ طلاق کے بعد ساری توجہ بیٹے کی طرف منعطف ہو گئی۔ تعلیم و تربیت اور غیر معمولی توجہ کی وجہ سے ان کے بیٹے مراد آگے چل کر نیورو سرجن ہو گئے۔

شادی سے لے کر طلاق تک کی منزل کا ذکر ڈاکٹر ناظم جعفری نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''پارہ کی شادی ڈاکٹر نصیر علی سے ۱۹۷۶ء میں ہوئی۔ ڈاکٹر نصیر بھی خوش شکل اور بظاہر تمام خوبیوں کے مالک تھے اور پاکستان آرمی میڈیکل کور میں سروس کرتے تھے۔ پارہ کی زندگی اور سوچ کو نیا رخ دینے والا یہی دور ہے۔ پارہ کے شوہر سروس کی وجہ سے باہر رہتے تھے اور اس کے سسرال والے قدیم روایتی انداز سے سوچتے تھے، جو کہ پارہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ کافی دنوں وہ اس کوشش میں رہی کہ اس ماحول میں خود کو ڈھال لے مگر وہاں روز نئی آفت، نیا کرب، رفتہ رفتہ اس نے اپنے جینے کا انداز بدلا اور دوبارہ کتابوں سے دل بہلانا شروع کر دیا اور آخر کار ۱۹۸۱ء میں اس نے C.S.S. اور پاکستان سول سروس کا امتحان اکتوبر ۱۹۸۲ء میں پاس کر لیا۔ ۱۹۸۳ء میں اسے ٹریننگ کے لیے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کسٹم اینڈ اکسائز سروسز کراچی بھیجا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۴ء میں اس کی پوسٹنگ بحیثیت اسٹنٹ کمشنر کسٹم ہاؤس کراچی میں ہوئی۔ اس نے کسٹم انٹیلی جنس کورس پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مکمل کیا۔ یہ ساری باتیں خود فراموشی کی کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں تھیں۔ مالی طور پر پارہ کبھی پریشان نہیں تھی اور اب تو بڑی آسائش کی ساتھ گزر رہی تھی۔ مگر وہ کرب جسے وہ ہر وقت محسوس کرتی تھی کبھی ختم نہ ہوا۔ سسرال والوں کا رویہ خراب سے خراب تر ہوتا گیا۔ اس درمیان میں کچھ خاص عزیز زیادہ سرگرم رہے۔ پارہ کو اللہ نے ایک بیٹا مراد ۱۹۷۹ء میں دیا۔ اس کے بعد حالات اور بگڑتے گئے، حتیٰ کہ ۱۹۸۷ء میں شوہر سے علیحدگی ہوگئی۔ آخر پارہ کے شوہر ڈاکٹر نصیر علی نے دوسری شادی کر لی، جس سے ایک لڑکی ہے۔ شاید پارہ سے علیحدگی ڈاکٹر نصیر علی کے احساس کمتری کا نتیجہ تھی۔ خیریت یہ ہوئی کہ پارہ کو اپنا بیٹا مراد مل گیا، جو اس کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔'' (۲)

اس طرح ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۹۴ء تک کم وبیش ۴۰ برسوں کے مسلسل تخلیقی سفر نے انہیں اردو کی نہایت مقبول شاعرہ بنا دیا۔ ان کے پانچ شعری مجموعے ''خوشبو''، ''صد برگ''، ''خود کلامی''، ''انکار'' اور ''کفِ آئینہ'' کی شکل میں اردو شاعری کے لیے ایک نہایت معتبر اور مقبول وسیلہ بن گئے۔ ''خود کلامی'' کا انگریزی ترجمہ بھی اسی زمانے میں شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا تھا۔ پروین شاکر نے ''گیتانجلی'' کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔ خود ان کی بہن نسرین شاکر کے مطابق یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ صرف ترجمہ ہے یا اس کی تصنیف ہے۔

پروین شاکر کا انتقال کار کے ایک حادثے میں ہوا۔ سامنے سے آنے والی ایک ٹرک نے ٹکر ماردی، ڈرائیور تو اسی وقت مر گیا اور پروین شاکر ایسی مجروح ہوئیں کہ اسپتال پہنچ کر انتقال کر گئیں۔ یہ حادثہ ۲۵ ر جنوری ۱۹۹۴ء کو ہوا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ انتقال سے پہلے ''فنون'' میں ان کی جو غزل شائع ہوئی تھی اس کا ایک شعر یوں ہے:

تیرے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی
اور تری بزم سے اب کوئی اٹھا چاہتا ہے

پروین شاکر کی اس حادثاتی موت کے سلسلے میں ڈاکٹر ناظم جعفری کے خیالات درج کر رہی ہوں:

''پروین شاکر کا حادثہ ۲۵ ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو صبح ۹/۳۰ بجے فیصل

چوک اسلام آباد میں ہوا۔ اس روز صبح سے ہی تیز بارش ہو رہی تھی۔ فضا دھندلی تھی اور سردی اپنے شباب پر تھی۔ اس وقت ٹریفک سگنل لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے آف تھا۔ ٹرک سے ٹکرانے کے بعد کار کا ڈرائیور جس کا نام یوسف تھا موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ پروین شاکر کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی، وہ بری طرح زخمی تھی اسے اسی حالت میں P.M.S اسپتال لے جایا گیا، مگر سر کی اندرونی چوٹ اور خون کے زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ جاں بر نہ ہو سکی۔ اسے پیر کے روز ۲۶ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو اسلام آباد کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ پروین شاکر کی قبر پر جو کتبہ ہے اس پر 'صد برگ' میں شامل اس کی ایک غزل کا مطلع لکھا ہوا ہے:

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے(۳)

اس ناگہانی حادثے اور ایسی ہونہار شاعرہ کے انتقال سے جہاں پوری ادبی برادری غم واندوہ میں ڈوب گئی وہاں صاحبان اقتدار اور سیاسی حلقے میں بھی زبردست جھٹکا محسوس کیا گیا۔ لاہور میں ''ادارہ معاصر'' کے زیر اہتمام ایک قومی ادبی کانفرنس ہوئی، جس میں اے این پی کے صدر اور ممتاز ادیب و دانشور اجمل خٹک مہمان خصوصی تھے۔ عطاالحق قاسمی کنویز اور اشفاق احمد نے صدارت کے فرائض انجام دئے۔ پاکستان نے اس حادثے کے بعد ایک تفصیلی پروگرام پیش کیا۔ ٹیلی ویژن پر یہ پروگرام نشر ہوا۔ پہلی برسی پر P.T.V نے پروگرام پیش کیا اور لوگوں کے دلوں میں یاد تازہ ہو گئی۔ پاکستان میں ایک ٹرسٹ قائم ہوا، جس کا نام ''پروین شاکر ٹرسٹ'' ہے،

جس کے بورڈ آف ٹرسٹیز میں تقریباً درجن بھر لوگ شامل ہیں۔

سینیٹر اعتزاز احسن نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ پروین شاکر کے پرستار رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی شاعری کی مثال اردو ادب میں نہیں مل سکتی۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''وہ زندگی کو برتنے کا سلیقہ جانتی تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دنیا کے بہترین تعلیمی ادارے ہارڈورڈ یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ تھی اور وہاں ایک عرصے تک برصغیر کی شاعری پر لکچر بھی دیتی رہی یعنی وہ ایک مکمل عورت تھی اور اس کی وفات سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے میں سمجھتا ہوں وہ بمشکل بھرے گا۔'' (۴)

پروین شاکر کے حادثہء انتقال نے یوں تو تمام شعرا وادبا کو متاثر کیا اور متعدد لوگوں نے اپنی شعری ونثری تحریروں کے ذریعہ رنج والم کا اظہار کیا۔

چنانچہ انکے انتقال پر ہم یہاں کتابچہ ''خوشبو کی شاعرہ پروین شاکرؔ'' کے حوالے سے چند اہم شخصیتوں کے تاثرات نقل کررہے ہیں احمد ندیم قاسمی جنہیں وہ اپنا مربّی خیال کرتی تھیں لکھتے ہیں کہ :

''نہ صرف قلم قبیلے کی آبرو تھی بلکہ اردو شاعری کا حسن بھی''

جناب احمد فراز لکھتے ہیں کہ :

''پروین شاکر کی شاعری اردو شاعری میں ایک نئی روایت تھی۔ اس نے عورت کے خالص ترین جذبات کو اپنی شاعری میں اس طرح سمویا ہے کہ شاعری انوکھا روپ اختیار کرگئی ہے........میں اس کی کس کس خوبی کی

تعریف کروں وہ جامع صفات تھی۔ اس کا لہجہ اس کی شاعری اس کا رکھ رکھاؤ اور اسکی ذہانت سب کچھ منفرد تھا'' (۵)

بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ :

''جدید شاعری کا منظرنامہ پروین شاکر کے دستخط کے بغیر نامکمل ہے''۔

جذبے کی جس سچائی سے پروین نے اُردو شاعری کے قارئین کے دل و دماغ کو متاثر کیا اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ بہر حال پروین شاکر اُردو شاعری کا ایک ایسا نام ہے جس نے اپنے منفرد لب و لہجے اور عورتوں کے نفسیاتی مسائل کو پیش کرنے کے اعتبار سے اُردو شاعری کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔

ڈاکٹر روبینہ شبنم نے پروین شاکر کو اُردو غزل کی ماہ تمام قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اُن کی شاعری گھر آنگن کی شاعری ہے۔ جس کا ہر عمل پُرکشش اور جس کا حسن گھریلو زندگی کو زندگی بخشتا ہے۔ دو محبت کرنے والوں کی دوستی، محبت، وفا، پیار ایک ایسی گھریلو فضا کو تشکیل دیتی ہے جس میں عشق و محبت کی واردات سکھیوں سے چھیڑ چھاڑ اور ان تمام لوازمات کا تعلق ہوتا ہے جن سے نسوانی کردار اپنی زندگی کی تزئین کاری کرتا ہے۔ صبح سے شام تک چھوٹے چھوٹے واقعات دو چاہنے والوں کی آپسی چھیڑ چھاڑ، کچھ ایسا ماحول دکھائی دینے لگتا ہے کہ جیسے ہم اپنی آنکھوں سے گھر کی مہک کو محسوس کر رہے ہوں۔'' (٦)

پروین کی شاعری نے شاعری کو وہ لب و لہجہ عطا کیا جہاں عورت ایک بیوی، ایک محبوب، ایک عاشق، ایک ماں، غرض کہ ہر صورت میں منعکس نظر آتی ہے۔ ایک ایسی عورت جو اپنے شریکِ حیات سے محبت کرتی ہے اور اس سے بدگمان بھی ہوتی ہے۔ جدائی میں پریشان بھی ہوتی ہے اور شکوے شکایت بھی کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس کی شاعری میں ہجر و وصال کی دھوپ چھاؤں ہے اور آس پاس کا منظر نامہ بھی ہے۔ غرض کہ پروین نے اپنی شاعری میں ایک مکمل عورت کا پیکر اُبھارا ہے، جہاں عورت یاس و آس کے درمیان جھولتی نظر آتی ہے۔ کہیں چاہت ہے، تو کہیں تڑپ، کہیں وصال کا لطف ہے تو کہیں جسم کی پیاس۔ اور یہ ساری چیزیں اس انداز سے اس کی شاعری میں اُبھر کر سامنے آتی ہیں کہ پڑھنے والوں کے ذہن و دماغ پر اپنا گہرا نقش قائم کر لیتی ہیں۔ صرف یہی نہیں الفاظ کی ترتیب و ترکیب، اندازِ بیان کا حسن، اسلوب کا جادو، نغمگی اور موزونیت اسے لازوال بنا دیتی ہے۔

24 نومبر 1952ء سے 25 دسمبر 1994ء تک پروین نے اپنی زندگی کے اس چھوٹے سے سفر میں جذبے احساس و شعور کے بڑے فاصلے طے کیے اور اپنے تخلیقی سفر کی روداد کو ادبی دنیا کے سامنے پانچ شعری مجموعوں: ''خوشبو''، ''صد برگ''، ''خود کلامی''، ''انکار'' اور ''کفِ آئینہ'' کی شکل میں پیش کر دیا۔ اُن کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''خوشبو' جو 1977ء میں شائع ہوا، جس کا انتساب احمد ندیم قاسمی کے نام ہے۔ اس مجموعے نے تمام اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس میں شامل غزلیں پہلی بار ایک

نئے لہجے اور نئے انداز کی نقیب بن کر سامنے آئیں۔ جس وقت یہ کتاب شائع ہوئی اس وقت اُن کی عمر صرف 25 سال تھی۔

''خوشبو'' کی شاعری اُردو شاعری میں ایک نیا تجربہ پیش کر رہی تھی۔ یہ شاعری وجدان اور حسیت سے بھرپور شاعری ہے۔ جہاں پروین شاکر نے محبت کے تجربے کو اس کی مختلف حسیاتی و نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ پیش کیا ہے اس میں وہ حسیات بھی شامل ہیں جو وصال و اختلاط کے لمحوں کا حصہ ہے اور جنہیں پروین شاکر نے بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

خوشبو ہے وہ تو چھو کے بدن کو گزر نہ جائے
جب تک مرے وجود کے اندر اُتر نہ جائے

خود پھول نے بھی ہونٹ کیے اپنے نیم وا
چوری تمام رنگ کی تتلی کے سر نہ جائے

خالدہ حسین نے خوشبو کے حوالے سے ان کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''اس میں ایک طرف حسیاتی طاقت کی جو رنگین خوشبو بھری دنیا ہے جس میں چوڑیوں کی میٹھی کھنک اور چنری کے شگفتہ رنگ ہیں، پھولوں کے میلے اور چاند تاروں کے کھیت اُگے ہیں۔'' (۷)

کم عمری میں ہی اُن کے پہلے مجموعے ''خوشبو'' کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ

شاید ہی کسی اور شاعرہ کو نصیب ہوئی ہو۔ اس کتاب پر انہیں 1978ء میں پاکستان کے ایک بہت بڑے اعزاز ''آدم جی ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ دوسرا انعام ''ماہِ تمام'' ایوارڈ تھا۔ تیسرا انعام ''پریسیڈنٹ ایوارڈ'' تھا۔ 1985ء میں انہیں ڈاکٹر محمد اقبال انعام سے نوازا گیا۔ اور پھر 1986ء میں انہیں U.S.I.S. ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ اور پھر حکومتِ پاکستان کا سب سے بڑا ایوارڈ ''پرائڈ آف پرفورمنس ایوارڈ'' انہیں ملا۔ اس کے علاوہ کئی گولڈ میڈل، بے شمار شیلڈس، ٹرافیاں اور توصیفی اسناد ان کے پاس تھیں۔ اُن کا سب سے بڑا انعام ان کی عوامی مقبولیت اور ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کا وہ اعتراف و احترام تھا جو وہ اُن کی شاعری کے لیے اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ پروین کی شاعری ہر وقت خوشبو بکھیرتی رہے گی۔ اس کی قبر پہ جو کتبہ ہے۔ اس پر صد برگ میں شامل اس کی ایک غزل کا یہ مطلع لکھا ہوا ہے:

مر بھی جاؤں کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے مرے ہونے کی گواہی دیں گے

شاید غالب کا یہ مصرعہ ان پر صادق آتا ہے کہ:

ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

انھوں نے ایک ہی قدم میں دشتِ امکاں کے تمام مرحلے طئے کر دیئے اور بقول اقبال:

عشق نے یک جست میں کر دیا قصہ تمام

دوسرے مجموعے ''صد برگ'' کی ترتیب واشاعت تک پروین شاکر کی زندگی نیا موڑ لے چکی تھی۔ چنانچہ اس میں شامل اشعار ذرا کھل کر ان حالات و کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ملاحظہ ہو چند اشعار:

کہاں سے آتی کرِن زندگی کے زنداں میں
وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی در ہی نہ تھا

اس کی مٹھی میں بہت روز رہا میرا وجود
مرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے

اس ترکِ رفاقت پہ پریشاں تو ہوں لیکن
اب تک کے ترے ساتھ پہ حیرت بھی بہت تھی

کیسی گھڑی میں ترکِ سفر کا خیال ہے
جب ہم میں لوٹ آنے کا یارا نہیں رہا

یہ اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ پروین شاکر نے خوشبوؤں کا سفر ختم کرتے ہوئے کانٹوں سے لہولہان ہونے کی تجربے کو صد برگ میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ صد برگ کے پیش لفظ میں اس احساس کو نہایت ہی شاعرانہ انداز میں پیش کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ :

''ہوا سے بڑھ کر اور کون منافق ہوگا کہ جو صبح سویرے پھول کو چوم کر جگاتی بھی ہے اور شام ڈھلے اپنے حریص ناخنوں سے اس کی پنکھڑیاں بھی نوچ لیتی ہے۔'' (۸)

بقول پروین شاکر:

''پھول کتنا ہی پامال کیوں نہ ہو اچھے دنوں پر یقین کرنے والے کوئی نہ کوئی شگون لے ہی لیتے ہیں۔ صد برگ بھی تمام تر ریزہ ریزہ ہونے کے باوصف اسی یقین پر مہر اثبات ہے۔'' (۹)

صد برگ کی پوری شاعری اسی احساس کی ترجمان ہے۔

شجر کو سبز قبا دیکھ کر یہ الجھن ہے
کہاں پہ رنگِ نمو ہے کہاں پہ زہر کا رنگ ہے

دھوپ کی رُت میں کوئی چھاؤں اُگاتا کیسے
شاخ پھُوٹی تھی کہ ہمسایوں میں آرے نکلے

پروین شاکر کا تیسرا مجموعہ ''خود کلامی'' پر مشتمل ہے یہ خود کلامی وہ خود کلامی ہے جس میں نہ کوئی عہد ہے نہ پیمان، نہ وعدہ جس میں اگر کوئی رنگ ہے تو حریفانہ ''جدائی کے بندی خانے'' میں ابھرنے والا ایک احساس ہے۔

بس اب تو جینے کا ایک ہی سلسلہ ہے جاناں!
تمھاری سوچوں میں ڈوبے رہنا
تمھارے خوابوں میں کھوئے رہنا

کسی طرح تم کو دیکھنے کی سبیل کرنا

تمھارے کوچے تک آنے کا کچھ بہانہ کرنا

ہر آتے جاتے سے خیریت کی نوید لینا

ہواؤں اور چاند اور پرندوں پہ رشک کرنا

مرا جو احوال پوچھنا ہے تو یہ ہے جاناں!

کہ جانے کب سے

جدائی کے بندی خانے میں بند

برف کی سِل پر تنہا بیٹھی

حرارتِ زندگی سے کچھ ربط ڈھونڈتی ہوں

بدن کو اپنے

تمھارے ہاتھوں سے چھو رہی ہوں!

یہ پوری نظم ''خود کلامی'' کے موضوع کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ خود کلامی کی شاعری پروین شاکر کی شاعری کا ایک اہم موڑ ہے۔ یہاں حالات کی تلخی اتنی تیز نہیں ہے۔ خوشبو میں جو خواب سجتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اب وہ خواب حقیقت کا سامنا کرتا نظر آتا ہے۔ دل اور محبت کے دائرے سے نکل کر اس کا دائرہ گھر آنگن تک پھیل جاتا ہے۔ ازدواجی الجھنیں، نفسیاتی گتھیاں، خارجی زندگی کی مصروفیات ان کے موضوعات کے حدود کو وسیع کرتی ہیں۔

ملاحظہ ہوں چند اشعار:

وہ مجبوری نہیں تھی، یہ ادا کاری نہیں ہے
مگر دونوں طرف پہلی سی سرشاری نہیں ہے

زندگی کی کوئی محرومی نہیں یاد آئی
جب تلک ہم تھے ترے قرب کی آسائش میں

مرنے اگر نہ پائی تو زندہ بھی کب رہی
تنہا کٹی وہ عمر جو تھی تیرے سات کی

''خود کلامی'' میں غزلوں کے بہ نسبت نظموں کا دائرہ موضوعاتی اعتبار سے زیادہ وسعت لئے ہوئے ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے اور زبان واسلوب کے لحاظ سے بھی خوشبو اور صد برگ کے مقابلے میں خود کلامی میں کافی تبدیلی نظر آتی ہے۔ یہاں ان کی فکر اس عورت تک پہنچ گئی ہے۔ جو آج کی مصروف زندگی میں جینے کے لئے گھر کے باہر قدم نکال چکی ہے۔ اس عورت کا درد ان کی نظموں میں اُبھر آتا ہے:

ہر صبح
میرے شانوں پر
ذمہ داری کا بوجھا لیکن
پہلے سے بھاری ہوتا ہے

پھر بھی میری پشت پہ

نا اہلی کا کوب

روز بروز نمایاں ہوتا جاتا ہے!

یہ کوب جو آج کی عورت کی پشت پر نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ خود کلامی میں اس تشنگی کا اظہار بھی مل رہا ہے، جسے جنسی تشنگی بھی کہا جا سکتا ہے۔ جنسی موضوعات پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں اکثر ایک ایسے لطیف احساس اور شرساری کی کیفیت ملتی ہے۔ جسے صرف عورت ہی محسوس کر سکتی ہے۔ خود کلامی کے کلام میں ایک اور بات جو نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے تراکیب و استعارات کو ایک نئی راہ پر موڑا ہے۔ اکثر سائنسی اصطلاحات کو علامت اور استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

ملاحظہ ہوں چند اشعار :

بعض محبتیں

اپنے بلڈ گروپ میں

"O" منفی ہوتی ہیں!

سو عافیت اسی میں ہے

کہ ہم اندھیرے میں رہیں

اور اپنے اپنے نیوٹرونز سے

تعلقات ٹھیک رکھیں

اسی طرح نیل پرنٹ، ایسوٹوپس، تابکار نفرتیں، طے یافتہ کیمیا، ہزاروں نوری سالوں کا فاصلہ جیسی سائنسی اصطلاحات بے ساختہ استعمال ہوئے ہیں۔ جسے پڑھتے ہوئے شاعری کی ایک نئی فریکوئنسی کا احساس ہوتا ہے۔ بلاشبہ انکا ویولینگتھ دوسرے شعرأ سے الگ ہے۔

''خوشبو'' سے ''خودکلامی'' تک انکے تینوں مجموعوں میں ایک چیز جو ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ وہ ہے ماضی کی تابندہ روایات سے ان کی وابستگی خاص طور پر کربلا ان کے یہاں جہد زندگی کی علامت بن کر ابھرا ہے۔ پروین نے اپنے کلام میں یہ استعارہ امید و یقین کے لئے استعمال کیا ہے اس امید یقین کے لئے کہ فتح اخر کار حق کی ہی ہوگی۔

کوفۂ عشق میں
میری بے چارگی
اپنے بالوں سے چہرہ چھپائے ہوئے
ہاتھ باندھے ہوئے
سر جھکائے ہوئے
زیرِ لب ایک ہی اسم پڑھتی ہوئی
یا غفور الرّحیم!
یا غفور الرّحیم!

ان تینوں مجموعوں کے مطالعے سے ایک اور بات جو ہمارے سامنے آتی ہے۔وہ ہے لفظیات کا استعمال، وقت کے ساتھ ساتھ پروین شاکر کی لفظیات میں تبدیلی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ''خوشبو'' میں جہاں پھول جیسے الفاظ' اپنی خوشبو بکھیرتے نظر آتے ہیں اور ایک دھنک رنگ خواب اور فضا کا احساس دلاتے ہیں۔ وہیں ''صد برگ'' میں یہ رنگ زہر رنگ بن جاتا ہے۔ اور ''خود کلامی'' میں انگریزی لفظیات کا استعمال زیادہ ہونے لگتا ہے۔ بہر حال ان تینوں مجموعوں کے بعد چوتھا مجموعہ ''انکار'' اس شعر سے شروع ہوتا ہے :

سج گئی بزمِ رنگ و نُور ایک نگاہ کے لئے
بام پہ کوئی آگیا زینتِ ماہ کے لئے

کبھی ''خوشبو' کبھی ''صد برگ'' اور کبھی محض ''خود کلامی'' سے گزرتے ہوئے ان کا وجود ایک نئے وجدان سے دو چار ہوتا ہے۔ اور تب ''انکار'' کی منزل آتی ہے۔ یہ انکار دراصل اپنے وجود کے اقرار کا احساس ہے۔ کیونکہ ''لا'' سے گزرنے کے بعد ہی ''الا'' کی منزل آتی ہے۔ ان کا چوتھا شعری مجموعہ ''لا'' سے الآ '' تک کے اس سفر کی سرگذشت ہے۔

بابِ حیرت سے مُجھے اِذنِ سفر ہونے کو ہے
تہنیت اِے دل کہ اب دیوار، در ہونے کو ہے

''انکار'' کی شاعری نشاطِ غم کی شاعری ہے۔

باغ کے در پہ قُفل پڑا ہے

اور خوشبو کے ہاتھ بندھے ہیں

کسے صدا دیں

لفظ سے معنی بچھڑ چکے ہیں

لوگ پُرانے اجڑ چکے ہیں

نابینا قانون وطن میں جاری ہے

آنکھیں رکھنا

جرم قبیح ہے

قابل دست اندازیٔ حاکمِ اعلیٰ ہے!

حبس بہت ہے!

اس نظم کے یہ اشعار ''انکار'' کی موضوعات کا ترجمان ہے۔ ''حبس بہت ہے'' پھر بھی ''بہت دل چاھتا ہے''

بہت دل چاھتا ہے

کسی دن غاصبوں کے نام لکھوں ایک کھلا خط

لکھوں اس میں

کہ تم نے چور دروازے سے آ کر

مرے گھر کا تقدس

جس طرح پامال کر کے

توشہ خانے کو تصرّف میں لیا ہے

تمھاری تربیت میں یہ رویہ

دشمنوں کے ساتھ بھی زیبا نہیں تھا!

قلم کا چھیننا

آساں نہیں ہے!

یہ درویشوں کی بستی ہے

دبے پاؤں بھی یاں آنے کی تم جرأت نہیں کرنا

کرائے پر

قصیدہ خواں اگر کچھ مل بھی جائیں تو

قبیلے کے کسی سردار کی بیعت نہیں ملتی!

انکار کی نظموں کا تیور ان دو اقتباس سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ پروین کی شاعری یہاں ذات کے حصار سے باہر نکل کر سماج کی حقیقتوں کا ادراک کرتی نظر آتی ہے۔ پاکستان کا سیاسی منظر نامہ بھی یہاں ابھرتا ہوا نظر آتا ہے:

سرحدوں کے نگہباں اب کرسیوں کے طلب گار ہیں

اپنے آقا کے دربار میں

جنبش چشم و ابرو کی پیہم تلاوت میں مصروف ہیں

اے خدا!

میرے پیارے وطن پر یہ کیسی گھڑی ہے

تراشے ہوئے جسم

آسائشوں میں پڑے

اپنی رعنائیاں کھو رہے ہیں

ذہن کی ساری یکسوئی مفقود ہے

اہلِ طبل و علَم

اہلِ جاہ و حشم بن رہے ہیں

پروین شاکر نے ایک جگہ ٹھیک ہی لکھا ہے کہ :

''پھولوں کی پنکھڑیاں چنتے چنتے آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی ------لڑکی شہر کی اس سنسان گلی تک آپہنچی ہے کہ مڑ کر دیکھتی ہے تو پیچھے دور دور تک کرچیاں بکھری ہوئی ہیں۔''

پروین شاکر کی پوری شاعری میں کرچیاں چننے کا عمل دکھائی دیتا ہے۔''انکا ر'' کی غزلوں میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔

ملاحظہ ہوں چند اشعار :

شیشۂ جاں کو مرے اتنی ندامت سے نہ دیکھ

جس سے ٹوٹا ہے یہ آئینہ وہ سنگ اور ہی تھا

زندگی بے سائباں بے گھر کہیں ایسی نہ تھی

آسماں ایسا نہیں تھا اور زمیں ایسی نہ تھی

میں تو اڑنا بھول جاؤں زندگی بھر کے لئے
بھر گیا ہے دل مگر مجھ سے مرے صیّاد کا

اس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

میرے بدن کو نمی کھا گئی اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکاں ڈھتا ہے

ان اشعار میں میرؔ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ میرؔ کی سی کسک ان کی شاعری کو اثر انگیز بنادیتی ہے۔ لیکن اس کسک کے ساتھ ساتھ ایک میٹھے۔ میٹھے درد کا احساس بھی شامل ہے۔ جو جادو جگاتا ہے۔

ملاحظہ ہوں چند اشعار:

وہ چشم تھی سحرکار بے حد
اور مجھ پہ طلسم کررہی تھی

خوشبو کو رقص کرتے ہوئے دیکھنے لگی
سحر بہار میں کہ طلسمِ صبا میں ہوں

شب سے بھی گزر جائیں گے گر تیری رضا ہو
دورانِ سفر مرحلۂ شام تو آیا

پروین شاکر نے ایک جگہ لکھا ہے:

''میری شاعری کی عورت سراپا انکار ہے اس نے جب تک اپنے جذبے کی قدر دیکھی مجسم سپردگی رہی لیکن جونہی زندگی کا رویہ تبدیل ہوا یہ عورت بپھر گئی۔''

اب کیا ہے جو تیرے پاس آؤں
کس مان پہ تجھ کو آزماؤں

''انکار'' میں پروین شاکر کی شاعری زندگی کے اعتراف کی صورت میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہاں جن تلخیوں کا اظہار ملتا ہے۔ اس کے پس پشت بھی دراصل زندگی سے محبت کا ہی جذبہ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ یہ زندگی کے مثبت قدروں سے محبت ہی ہے جو منفی قدروں کے انکار کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

کتاب زندگی کے سفید سیاہ ورق الٹتے چلے جا رہے ہیں۔

پت جھڑ سے ہے، گلا نہ شکایت ہوا سے ہے

پروین شاکر کی دوسری برسی کے موقع پر ان کی بہن نسرین شاکر کے زیر نگرانی میں پروین شاکر کا پانچواں اور آخری شعری مجموعہ ''کفِ آئینہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ دراصل خود ان کا ہی ترتیب دیا ہوا تھا۔ اور اس کا نام ''کفِ آئینہ'' بھی ان کا ہی رکھا ہوا ہے۔

تخت ہے اور کہانی ہے وہی
اور سازش بھی پرانی ہے وہی

جیسا کہ شعر سے ظاہر ہے۔ ''کفِ آئینہ'' میں پروین شاکر کا جو کلام محفوظ کیا گیا ہے اس میں وہ تمام موضوعات شامل ہیں۔ جن سے پروین شاکر کی انفرادی شناخت قائم ہوتی ہے۔

مٹھی میں تو رنگ تھے ہزاروں
بس ہاتھ سے ریت بہہ رہی تھی

تجھ سے ملنے کی سرخوشی کے ساتھ
ایک اُداسی کی لہر دل میں ہے

جس طرح آئینہ اپنے سامنے کھڑے پیکر کا پورا وجود اپنے اندر سمیٹ کر اسے منعکس کر دیتا ہے۔ اسی طرح ''کفِ آئینہ'' میں پروین شاکر کے وجود کا پورا عکس دکھائی دیتا ہے۔

ایک ایسی عورت کا عکس جو محبت بھی کرتی ہے۔ بدگمانیوں کا شکار بھی ہوتی ہے۔ وصال کی خوشبو سے سرشار بھی ہوتی ہے۔ اور ہجر کی پریشانیوں کا شکار بھی ہوتی ہے۔ آس و یاس کے درمیان جھولتی بھی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تقریباً ہر غزل میں ایسے اشعار موجود ہیں۔ جو عورت کی زندگی کا آئینہ ہیں۔ ہر شعر میں یہ عورت اپنے تمام تر حالات اور جذبات کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

تجھے تو علم تھا زنجیر کا میری
جو پیروں میں بھی ہے

اور روح پر بھی

میں اپنے بخت کی قیدی ہوں

ضعف سے سر اک طرف

زخم سارے تازہ رو

پروین شاکر کا جو دور تھا ختم ہوگیا۔ مگر اسکا چھوڑا ہوا نقش باقی ہے۔ اور اردو کے اہل نظر اسے کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ لکھنے اور سمجھنے کے لئے بہت کچھ باقی ہے۔ ڈاکٹر ناظم جعفری نے ایک سانیٹ کی شکل میں پروین شاکر کا جو خاکہ پیش کیا ہے۔ وہ اسکے فن اور شخصیت کا ترجمان ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

''جواب آپ ہے اپنا کہ لاجواب ہے وہ

بہت قریب سے دیکھی ہے زندگی اس نے

اب اس جہاں کے لئے صرف خواب ہے وہ

کہاں وہ بات جو سوچی کہی سنی اس نے''

پروین شاکر صرف شاعرہ ہی نہیں تھیں بلکہ ایک دانشور بھی تھیں۔ بقول افتخار امام صدیقی:

> ''درس تدریس سے سرکاری ملازمت تک اس نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ اخباری کالم نگاری ہو یا ٹی۔وی پر لئے جانے والے ادباء وشعراء سے مکالمے ومصاحبے اسکی انفرادیت ہر جگہ نمایاں رہی۔ وہ اپنے باطن میں نامعلوم گہرائیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسکا وجدان اتنا

نازک اور حساس تھا کہ وہ اپنی سوچ سمندر سے بآسانی ایسے اشعار نکال
لاتی تھی کہ وہ شاعری کی اجتماعی پسند کا نغمہ بن جاتے تھے.........
پروین نے اپنی شعری بوطیقا کو زمانوں زمانوں میں محفوظ کر دیا۔"(۱۰)

○

حواشی

۱ سرگزشت، پروین شاکر، ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، اشاعت: ۲۰۰۸، ص ۴۶
۲ رسالہ "آج کل"، دہلی، ستمبر ۱۹۹۶، ص ۱۰
۳ پروین شاکر، ناظم جعفری، ماہنامہ "آج کل"، ستمبر ۱۹۹۶، ص ۱۱
۴ اردو غزل کی ماہِ تمام: پروین شاکر، اشاعت ۲۰۰۴، ص ۱۴
۵ خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر، احمد فراز
۶ اردو غزل کی ماہِ تمام، روبینہ شبنم، ص ۶۰
۷ کانچ کی گڑیا، خالدہ حسین، مطبوعہ 'شاعر'، شمارہ ۱۳، ۱۹۹۴، جلد ۶۵
۸ صد برگ، ص ۱۴
۹ صد برگ، ص ۱۴
۱۰ خوشبو کے پر کتر کے گیا راستہ کہاں، افتخار امام صدیقی، مطبوعہ ماہنامہ 'شاعر'، شمارہ ۱۳، ۱۹۹۴

پروین شاکرؔ کی غزلیں: ایک تنقیدی جائزہ

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف رہی ہے۔ موضوعات کی ہمہ جہتی اور اسلوب و اظہار کے تنوع کے سبب اسے ہر دور میں اور عوام کے ہر طبقہ میں مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ کسی دوسری صنف کو حاصل نہ ہو سکی۔ ہر چند کے آزاد سے لے کر حالیؔ تک اور پھر عظمت اللہ خاں، وحیدالدین سلیم اور کلیم الدین احمد تک، غزل پر اعتراضات کا ایک لمبا سلسلہ بھی موجود ہے۔ یہاں تک کہ نیم وحشی صنف سخن کہہ کر اس کا مذاق بھی اڑایا گیا اور بے تکلف اس کی گردن مار دینے کا فتویٰ بھی صادر کیا گیا۔ لیکن اس نے اردو شاعری کی آبرو کی حیثیت سے خود کو منوا ہی لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہماری تہذیبی، فکری اعتقاد و تصور اور ہمارے انفرادی و اجتماعی جذبات و احساس کی ترجمانی کا جو فریضہ غزل تقریباً پانچ سو سال سے انجام دیتی آرہی ہے۔ اس کی مثال ادبیات تاریخ عالم میں مشکل سے مل پائیگی۔ امیر خسرو سے قلی قطب شاہ اور ولیؔ دکنی تک اور پھر میر تقی میرؔ سے پروین شاکر تک اردو غزل کی تاریخ دراصل ہماری پوری تہذیبی تاریخ کا پر تو ہے۔ اور غزل کا مطالعہ دراصل اسی تہذیبی وثقافتی ورثہ کے مطالعہ کی ایک صورت ہے۔ غزل کے تعلق سے اظہار خیال کرتے

ہوئے احمد پراچہ لکھتے ہیں:

''پروین شاکر کی غزل کا مطالعہ دراصل اس غزل کا مطالعہ ہے جو ہر طرح کی مخالفت کے باوجود ہر دور میں زندہ اور توانا صنف کی شکل میں موجود ہے۔''(۱)

نجمہ رحمانی نے بھی اپنی تصنیف ''آزادی کے بعد اردوٗ شاعرات'' میں پروین کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جدید غزلیہ شاعری میں پروین شاکر کا مقام اس حیثیت سے منفرد ونمایاں ہے کہ انھوں نے غزل کو خالص غزل بنا کر پیش کیا۔ اینٹی غزل، بے تکلف غزل اور آزاد غزل جیسی اصناف کے ہجوم میں پروین شاکر کی غزلیں ایک تروتازہ اور شگفتہ انداز لے کر آئیں۔''(۲)

جہاں تک غزل کو خالص غزل بنا کر پیش کرنے کی بات ہے کہا جاتا ہے کہ غزل کا ایک معنی بازی کردن از جوانی ہے۔ اور جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے۔ یہ دیوانگی اسلئے طاری ہوتی ہے کہ اس عمر میں پاسبان عقل دل کو کبھی کبھی تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ فکر فردا نہ غم دوش بس احساس کی شدت اور جذبات کا جوش، چاہے جانے کی تمنا اور کسی کو پالینے کی آرزو اور ان سب کا اظہار جب لفظوں کے آہنگ میں ڈھل جاتا ہے تو غزل ہوتی ہے اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پروین شاکر کے یہاں غزل کی یہی معنویت اپنا جادو جگاتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے جیسے:

تخیل ماہتاب ہو، اظہار آئینہ
آنکھوں کو لفظ لفظ کا چہرہ دکھائی دے

پروین کی غزلوں میں جوانی کے جذبات کی کہی ان کہی داستانوں کا ایک سلسلہ ہے۔ جہاں شباب کے نشیب و فراز میں ڈوبتے ابھرتے جذبات جادو جگاتے ہیں ملاحظہ ہوں ان کی غزل کے یہ چند اشعار:

ہوا کی دُھن پر بن کی ڈالی ڈالی گائے
کوئل کوکے، جنگل کی ہریالی گائے

رُت وہ ہے جب کونپل کی خوشبو سُر مانگے
پُروا کے ہمراہ عمریا بالی گائے

رنگ منایا جائے، خوشبو کھیلی جائے
پھول ہنسیں، پتے ناچیں اور مالی گائے

میرے بدن کا رواں رواں اس میں بھیگے
رات نشے میں اور ہوا بھوپالی گائے

محنت کی سندرتا کھیتوں میں پھیلی ہے
نرم ہوا کی دُھن پر دھان کی بالی گائے

غزل کا یہ لب ولہجہ نیا نیا سا ہے۔ اس میں جذبات کا جوش احساس کی جو شدت ہے۔ لفظوں کا جو آہنگ ہے وہ قابل غور ہے۔ غزل وفور جذبات میں ڈھل جانے کا ہی تو نام ہے۔ وفور جذبات سے لبریز یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کہہ رہا ہے کسی موسم کی کہانی اب تک
جسم برسات میں بھیگے ہوئے جنگل کی طرح

وہ عکس موجۂ گل تھا، چمن چمن میں رہا
وہ رنگ رنگ میں اترا، کرن کرن میں رہا

الفاظ تھے اس کے بہاروں کے پیامات
خوشبو سی برسنے لگی یوں، پھول جھڑے وہ

وہ نرم لہجے میں کچھ تو کہے کے لوٹ آئے
سماعتوں کی زمیں پر پھوار کا موسم

پروین شاکرؔ نے جس طرح سے جذبوں کو زبان عطا کی ہے تجربے اور واردات کو جس طرح ایک پُراثر لے میں ڈھال دیا ہے۔ اسی کا نام تغزل ہے۔ شیفتگی و فریفتگی، بے خودی و مدہوشی کی کیفیت اور شباب کی رندی و سرمستی کے ساتھ ایک خاص انداز کی سنجیدگی پروین شاکرؔ کی غزلوں میں ایک نغمگی اور دلنوازی پیدا کرتی ہے۔

غزل کا ایک اور مفہوم یہ بیان کیا جاتا ہے۔ اسے حدیث محبت و عشق زنان قرار دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ صورت بھی احساس کی شدت اور جذبات کے جوش کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک ایسی عمر جس میں ہر چیز جو ہماری دسترس سے باہر ہے حسین معلوم ہوتی ہے وفور جذبات اس صورتحال کو جنم دیتی ہے۔ کہ کسی کو پالینے کی تمنا کسی کو حاصل کر لینے کی آزاد تخیل کو جھولے جھلاتی ہے:

جستجو کھوئے ہوؤں کی عمر بھر کرتے رہے
چاند کے ہمراہ ہم ہر شب سفر کرتے رہے

پروین کی غزلوں میں جادو بکھیرنے کی کیفیت نظر آتی ہے۔ نازک جذبوں کا لوچ اسمیں نغمگی پیدا کرتا ہے۔ وصال یار کا خوش آئین تصور اس میں رنگ بھرتا ہے اور عشق کا والہانہ پن اسے ہر نوجوان دل کی دھڑکن بنا دیتا ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتی ہیں:

میرے چہرے پہ غزل لکھتی گئیں
شعر کہتی ہوئی انکھیں اس کی

اپنی رُسوائی، ترے نام کا چرچا دیکھوں
ایک ذرا شعر کہوں اور میں کیا کیا دیکھوں

قامتِ شعر کی زیبائی کا عالم مت پوچھ
مہرباں جب سے ہے اُس سرو بدن کی خوشبو

رنگ و نور کی بارش، جذبہ وکیف کی ترنگ اور اُس کے خوبصورت مظاہرے پروین شاکر کی غزلوں کی پہچان ہیں۔ ان غزلوں میں عشق ومحبت کا جو والہانہ پن ہے۔ خود سپردگی کا جو لطیف احساس ہے وہی انکی شناخت ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

عارضِ گل کو چھوا تھا کہ دھنک سی بکھری
کس قدر شوخ ہے ننھی سی کرن کی خوشبو

مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رُت میں مہکتا دیکھوں

ہوا چلی تو نئی بارشیں بھی ساتھ آئیں
زمیں کے چہرے پہ آیا نکھار کا موسم

وہ میرا نام لئے جائے اور میں اس کا نام
لہو میں گونج رہا ہے پکار کا موسم

پھول کی طرح مرے جسم کا ہر لب کھل جائے
پنکھڑی پنکھڑی اُن ہونٹوں کا سایہ دیکھوں

اتر رہی ہے عجب خوشبوئیں رگ وپے میں
یہ کس کو چھو کے مرے شہر میں صبا آئی

کبھی کبھی ترے لہجے کی شبنمی ٹھنڈک
سماعتوں کے دریچوں پہ خواب خواب اترے

سپردگی کا مجسم سوال بن کے کھلوں
مثال قطرۂ شبنم ترا جواب اُترے

میں اپنے حصّے کے سکھ جس کے نام کر ڈالوں
کوئی تو ہو جو مجھے اس طرح کا پیارا ہو

پروین شاکر کے یہ اشعار عنفوان شباب کے جذبات کا عکس پیش کرتے ہیں۔ڈاکٹر رشید امجد نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ پروین شاکر کے یہاں :

''عنفوانِ شباب کے اولیّن نسوانی جذبوں اور وارداتوں کا قدرے شائستہ اور رمزیاتی اسلوب بیان ملتا ہے۔ پروین شاکر نے اپنے احساسات کو ایک نئی پختگی کے ساتھ اپنی گرفت میں لیا ہے۔'' (۳)

عنفوان شباب کی موجیں اکثر جوار بھاٹا کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور تب یہ احساس جاگتا ہے:

جکڑے ہوئے ہے تن کو مرے اس کی آرزو
پھیلا ہوا ہے جال سا شریان کی طرح

یہ احساس ایک وجدانی کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے کہ:

مٹی کی مہک سانس کی خوشبو میں اتر کر
بھیگے ہوئے سبزے کی ترائی میں بلائے

اور ایسے میں لگتا ہے کہ

چکھوں ممنوعہ ذائقے بھی
دل سانپ سے دوستی بڑھا دے

جذبے کی آنچ جسم کی تڑپ بن کر ظاہر ہوتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ:

خوشبو ہے وہ تو چھو کے بدن کو گزر نہ جائے
جب تک مرے وجود کے اندر اتر نہ جائے

رنگ خوشبو میں اگر حل ہوجائے
وصل کا خواب مکمل ہو جائے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جسم کی خوشبو اور وصال کی رعنائیوں کا ذکر بھی ان کے اشعار میں ایک خاص قسم کی لطافت کا سبب ہیں۔ غرض کہ پروین شاکر کی غزلوں کا محور عشق ہے۔ یہاں حسن و جمال کی رعنائیوں، تخیل کی سحر انگیز خواہش اور طلب وصال کی رنگین کیفیات کا خوبصورت اظہار ملتا ہے اور یہی انکے تغزل کی جان ہے۔ ویسے تو عشق محبت اردو غزل کا بنیادی موضوع رہا ہے، کوئی ایسا غزل گو شاعر نہ ہوگا جس نے ان کیفیات کا اظہار اپنے اشعار کے ذریعے نہیں کیا ہوگا، لیکن پروین شاکر کے یہاں یہ عشق جس طرح سے ایک الھڑ دوشیزہ کے نسوانی جذبات، کچی عمر، نازک جذبوں، آرزوں کو عکس در عکس سامنے لاتا چلا جاتا ہے، اس کی مثال پہلے کہیں نہیں ملتی۔ نسائیت سے بھرپور اظہار پروین شاکر کے یہاں تغزل کی ایک نئی شناخت قائم کرتا ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعہ کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نظیر صدیقی ایک جگہ لکھتے ہیں :

> ''خوشبو بنیادی طور پر عشق کے جذبات وتجربات کی شاعری ہے اور اردو کے عشقیہ شاعری کے سرمائے میں ایک نہایت منفرد اور خوبصورت اضافہ ہے۔'' (۴)

''آزادی کے بعد اردوُ شاعرات'' کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے بھی ان کے پہلے شعری مجموعہ ''خوشبو'' کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ان کی عشقیہ شاعری میں سمندر کی گہرائی اور شہد کی مٹھاس ہے نازک جذبوں کا لوچ اور ہجر کی کسک ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کی آرزوئیں اس کے خواب ان کے ذہن کے جھروکوں سے خوشبو کے کینوس پر بکھرتے چلے گئے ہیں۔'' (۵)

''خوشبو'' پروین شاکر کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں سو سے زائد غزلیں شامل ہیں ان میں سے ہر غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ

سرگوشئ بہار سے خوشبو کے در کھلے
کس اسم کے جمال سے بابِ ہُنر کھلے

دراصل ایک نوجوان لڑکی کی آرزوئیں اور خواب اس کے ذہن کے جھڑوکوں سے خوشبو کے کینوس پر عکس درعکس ابھر کر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ ان غزلوں کے اشعار کو ایک خاص ترتیب سے سجا کر پیش کیا جائے تو اس میں پہلے چاہتوں آرزؤں اور تمناؤں کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔

تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن، مور بن کر ناچتا ہے

عارضِ گل کو چھو اتھا کہ دھنک سی بکھری
کس قدر شوخ ہے ننھی سی کرن کی خوشبو

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی

کوئی تو ہو جو مرے تن کو روشنی بھیجے
کسی کا پیار ہوا میرے نام لائی ہو!

اور پھر جب ہوا کسی کا پیار لے کر آتی ہے تو لگتا ہے:

وہ نرم لہجے میں کچھ کہہ رہا ہے پھر مجھ سے
چھڑا ہے پیار کے کومل سُروں میں مدھم پھر

یہ کیا کہ میں تری خوشبو کا صرف ذکر سنوں
تو عکسِ موجۂ گل ہے تو جسم وجاں میں اُتر

پھر یہ دیکھئے کہ قدرت اس پر کتنی مہربان ہوتی ہے۔ اس کی یہ خواہش بھی کتنی جلد پوری ہوجاتی ہے:

وہ رُت بھی آئی کہ میں پھول کی سہیلی ہوئی
مہک میں چمپا کلی، روپ میں چنبیلی ہوئی

پھر وصالِ یار کی خوشبو سے اُس کا انگ انگ مہک اٹھتا ہے:

سما کے ابر میں، برسات کی اُمنگ میں ہوں
ہوا میں جذب ہوں خوشبو کے انگ انگ میں ہوں

یہ پورا مرحلہ پروین شاکر کی شاعری میں دلنواز ساعتوں کی صورت روبرو ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے صفحات میں پیش کردہ اشعار سے اندازہ ہوتا ہے۔ ایک سرشاری کی کیفیت ہر سُو نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

پیرہن میرا مگر اس کے بدن کی خوشبو
اُس کی ترتیب ہے ایک ایک شکن کی خوشبو

رات جب پھول کے رُخسار پہ دھیرے سے جھکی
چاند نے جھک کے کہا اور ذرا آہستہ

مگر کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔ سرشاری وسرمستی کی یہ کیفیت بہت جلد زوال آمادہ نظر آنے لگتی ہیں۔ چاندنی راتوں کا سہانا پن اماوس کے گھن گھور اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے:

اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کس اُمید پہ دروازے سے جھانکے کوئی

تمام رات میرے گھر کا ایک دَر کھلا رہا
میں راہ دیکھتی رہی، وہ راستہ بدل گیا

وہ کہ جن کے ہاتھ میں تقدیر فصلِ گل رہی
دے گئے سوکھے ہوئے پتّوں کا نذرانہ ہمیں

اب اُن دریچوں پہ گہرے دبیز پردے ہیں
وہ تاک جھانک کا معصوم سلسلہ بھی گیا

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

مگر پھر وہی صبر وضبط کا مظاہرہ اور ایک طرفہ وفاداری کا اظہار:

سکھ تری میراث تھے تجھ کو ملے
دکھ ہمارے تھے مقدر ہوگئے

چہرا نہ دکھا صدا سنادے
جینے کا ذرا توحوصلہ دے

ہجر کی ماری ایک لڑکی سب کچھ بھول کر بھی اپنے سلے ہوئے ہونٹوں کو کھول نہیں پاتی۔ ایسا اس لئے ہے کہ جولڑکی بسنت بہار کی نرم ہنسی میں بھیگ چکی ہو اُسے خزاں سے دُکھ تو ہوسکتا ہے۔ لیکن بہار سے شکوہ نہیں ہوسکتا۔ یہ بات خود پروین شاکر نے ''خوشبو' کے پیش لفظ میں کہی ہے۔

چنانچہ وہ اپنے دل کو یہ سمجھاتی ہے کہ:

اسکی خفگی جاڑے کی نرماتی دھوپ
پاروسکھی! اس حدت کو ہنس کھیل کے سہہ

دل کے مندر میں ایک بار جس کی صورت بس گئی تو پھر زندگی بھر اس کی پجارن بن کر لڑکیاں اپنی عمر گزار دیتی ہیں یہاں تک کے اس کے تمام تر ہرجائی پن کے باوجود اپنے دل کو یہی سمجھاتی ہیں:

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

پھر یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتی ہے کہ:

نہیں نہیں! یہ خبر دشمنوں نے دی ہوگی
وہ آئے آ کے چلے بھی گئے ملے بھی نہیں

لیکن حقیقت بہر حال حقیقت ہوتی ہے اور اسے یہ احساس کچو کے لگاتا ہے کہ:

میں پھول چنتی رہی اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ شخص آ کے مرے شہر سے چلا بھی گیا

اس کے باوجود وہ دل کے مندر میں بسی اُس صورت کو باہر نکال کر نہیں پھینکتی ہے۔ ایک بار جسے دیوتا مان لیا تو پھر اس کی ہر مرضی سر آنکھوں پر چنانچہ جب اس کے سامنے یہ حقیقت آتی ہے کہ اس کا محبوب کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہے۔ تب اپنی وفا اور محبت کے نام پر اپنے دیوتا کی خوشی کے لئے یہ فیصلہ بھی کر لیتی ہے کہ:

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دُلہن سجاؤں گی

سپرد کر کے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ آؤں گی

ایک طرف تو ایثار و قربانی اور ضبطہ وصبر کی یہ صورت ہے۔ لیکن دوسری طرف محبوب کا منافقانہ رویہ:

کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
ترا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

پروین شاکر کی شاعری میں برہن کے درد کا اظہار ایک ایسی کسک پیدا کرتا ہے ایک ایسی ٹیس کا احساس دلاتا ہے جس نے ان کی شاعری کو لازوال بنادیا شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ میرؔ کی شاعری میں ابھر کر سامنے آنے والا درد وہ درد ہے جسے میرؔ نے صرف محسوس نہیں کیا ہے، بلکہ جسے میرؔ نے جھیلا ہے۔ ذات کے درد سے کائنات کے درد تک رسائی حاصل کی ہے۔ پروین شاکرؔ کے یہاں بھی کچھ ایسی صورت نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں جو لڑکی نظر آتی ہے وہ خود پروین شاکرؔ ہے جس نے خوابوں کی ایک دنیا سجائی، خوابوں کے شہزادے سے اس کی شادی ہوگئی، لیکن جلد ہی سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ پروین شاکرؔ کی پوری شاعری میں ان کی ناہموار ازدواجی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ پروین شاکرؔ نے اپنی شاعری میں جن علامتوں اور استعاروں کا استعمال کیا ہے۔ ان سب کے ساتھ اس کے احساس کا گہرا رشتہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب پروین شاکرؔ سے ایک انٹرویو۔کے دوران یہ پوچھا گیا کہ، ایک پروین بیوی ہے، ایک معلمہ اور ایک شاعرہ کی حیثیت سے ہمارے

سامنے ہے تو کیا کوئی ایسی بھی پروین ہے جو لوگوں سے مخفی ہے؟ پوچھنا یہ ہے کہ اصل پروین کون ہے؟ تو اس کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ ہر جگہ انسان کا رویہ بدلتا ہے، ماحول کے مطابق لہجہ بدل جاتا ہے، لیکن "خوشبو" میں اصل پروین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ''خوشبو'' کی شاعری انکشاف ذات کی شاعری ہے

''شہرزات ..... کہ جس کے سب دروازے اندر کی طرف کھلتے ہیں
اور جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں..... پھولوں کی پنکھڑیاں چُنتے چُنتے
آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی شہر کی اس سنسان گلی تک آ پہنچی ہے کہ مڑ
کے دیکھتی ہے تو پیچھے دُور دُور تک کرچیاں بکھری ہوئی ہیں۔'' (۶)

خوشبو کے بعد ''صد برگ'' پروین شاکر کی شاعری کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس میں شامل غزلوں کا مطالعہ یہ احساس دلاتا ہے کہ محبت میں یوں بھی ہوتا ہے کہ نشاطِ وصل کا تصور حسرتِ وصل کا آئینہ دار بن جاتا ہے:

کمال شوخ سے چھیڑا تھا جن کو مطرب نے
وہ راگ ساز کے سینے سے نوحہ خواں نکلے

منظر نامہ تو "خوشبو" کے مکمل ہوتے ہوتے ہی بدل چکا تھا مگر اس کا باقاعدہ اعلان ''صد برگ'' میں ہوتا ہے جیسا کہ وہ خود کہتی ہیں:

''صد برگ تک آتے آتے منظر نامہ بدل چکا تھا...... میری زندگی کا
بھی اور اس سرزمین کا بھی جس کے ہونے سے میرا ہونا ہے...''

جون ۱۹۸۸ کراچی

۱۹۹۰ اسلام آباد

پروین شاکر کے جملے یہ بتا رہے ہیں کہ صد برگ کی شاعری ایک طرف تو ان کی زندگی کے بدلتے ہوئے اس رنگ کا اظہار ہے جب:

''نہ وہ خواب تھا، نہ وہ باغ تھا، نہ وہ شہزادہ، اچھے رنگوں کی سب پریاں اپنے طلسمی دیس کو اُڑ چکی تھیں اور لہولہان ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملتی شہزادی جنگل میں اکیلی رہ گئی.........'' (۷)

''سنگینوں میں پروئے ہوئے بچّے اور نیزوں پہ سجے ہوئے جوان سر، میری نگاہوں کے سامنے سے گذرتے رہے........اور میں قتل ہونے والوں کے نام تک نہ پوچھ سکی............کہ ایسا کرنے میں وفاداریاں مشکوک ہوجاتی ہیں۔'' (۸)

صد برگ میں شامل غزلوں میں ذات کا درد کائنات کا درد بن جاتا ہے۔ جہاں انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہونے والی حق تلفیوں اور ناانصافیوں کو جھیلتے ہوئے جب شاعرہ سماجی سطح پر ہونے والی ناانصافیوں پر نظر ڈالتی ہے۔ تو اسے ہر طرف کربلا کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح کربلا کے میدان میں (۱۰) دس محرم کو امام حسین کے منھ سے ادا ہونے والے کلمات حق تلفی و ناانصافی، جبر و تشدد نمرود سرکشی کے خلاف ایک صدائے احتجاج بن کر گونجے تھے اُسی طرح صد برگ میں پروین شاکر کی شاعری انفرادی اور سماجی سطح پر ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف ردِّعمل کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

جو بادلوں سے بھی مجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی ہے دھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا

عقب میں گہرا سمندر ہے سامنے جنگل
کس انتہا پہ مرا مہربان چھوڑ گیا

یہ اشعار جہاں ''خوشبو'' کی اس لڑکی کے احساس کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے محبوب نے:

زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا

وہیں درج ذیل اشعار میں اس معاشرے کی صورتِ حال کو محسوس کیا جا سکتا ہے ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

لہو جمنے سے پہلے خوں بہادے
یہاں انصاف سے قاتل بڑا ہے

سوچ رکھنا بھی جرائم میں ہے شامل اب تو
وہی معصوم ہے ہر بات پہ جو صاد کرے

وہ بھی سرِ مقتل ہے کہ سچ جس کا تھا شاہد
اور واقفِ احوال عدالت بھی بہت تھی

جب لہو بول پڑے اس کے گواہوں کے خلاف
قاضیٔ شہر کچھ اس باب میں ارشاد کرے

پروین شاکر کو یہ احساس بار بار ستاتا ہے کہ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور ناانصافی کی اصل وجہ سماج کے بنائے ہوئے فرسودہ اصولوں کے سبب ہے جس کا

شکار سماج کا ہر فرد ہے۔ اس لئے وہ کہتی ہے:

تمام لوگ اکیلے تھے راہبر ہی نہ تھا
بچھڑنے والوں میں اک میرا ہم سفر ہی نہ تھا

کہاں سے آتی کرن زندگی کے زنداں میں
وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی دَر ہی نہ تھا

جدھر دیکھوں کھڑی ہے فصل گریہ
مرے شہروں میں آنسو بوگیا کون

دھوپ کی رُت میں کوئی چھاؤں اگاتا کیسے
شاخ پھوٹی تھی کہ ہم سایوں میں آرے نکلے

مشکل ہے کہ اب شہر میں نکلے کوئی گھر سے
دستار پہ بات آگئی ہوتی ہوئی سر سے

اور شاید یہی وجہ ہے کہ محبوب کی تمام تر رفاقتوں کے باوجود وہ یہ کہتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

تجھ سے کوئی گِلہ نہیں ہے
قسمت میں مری صلہ نہیں ہے

میں ایسے شخص کی معصومیت پہ کیا لکھوں
جو مجھ کو اپنی خطاؤں میں بھی بھلا ہی لگا

بچھڑ کے وہ مجھے لوٹا گیا ہے میرا وجود
یہ سانحہ مرے حق میں تو نیک فال ہی تھا

صد برگ کی بیشتر غزلیں احتجاج کے تیر و کمان سے پوری طرح آراستہ ہیں۔ لہجے میں باغیانہ تیور موجزن ہے۔ یہاں انھوں نے سماج کے بنائے ہوئے ان فرسودہ اصولوں کی جگہ جگہ نشاندہی کی ہے جن کا سہارا لے کر ہر روز انسانیت اور شرافت کا ایک نئے انداز سے قتل کیا گیا۔ جبر، سرکشی، تشدد، منافقت، استحصال اور شرافت، ہمدردی، انسانیت، خیر سگالی اور رواداری کے بیچ ایک معرکہ خیر وشر ہے جو پروین کی داخلی زندگی میں بھی جاری ہے اور خارجی زندگی میں بھی۔ ''صد برگ'' کی شاعری اس کے خلاف ایک صدائے احتجاج کی بازگشت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

''صد برگ'' کے بعد کی شاعری ایک Turningpoint کی حیثیت رکھتی ہے جہاں فن اور موضوع دونوں اعتبار سے ایک نیا موڑ دکھائی دیتا ہے۔ اس موڑ پر پروین شاکر کی غزلوں میں ہمیں خود احتسابی کا عمل دخل غالب نظر آتا ہے ان کی غزل کا ہر شعر اس احساس کی ترجمانی کرتا ہے:

مجھ میں ایسی ہی خامی دیکھی اس نے
ترک وفا ورنہ اتنا آسان نہیں

وقت کے ساتھ عناصر بھی رہے سازش میں
جل گئے پیڑ کبھی دھوپ، کبھی بارش میں

خود احتسابی کا یہ عمل دراصل محبت کی اس انتہا کے نتیجے میں سامنے آتا ہے جب محبوب کا عیب بھی خوبی بن کر سامنے آتا ہے۔ اور ساری خامی اپنی دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ پروانہ کے عشق کی انتہا تو یہی ہے کہ شمع پر جان دیدے اور شمع کا تو کام ہی جلانا ہے، عشق کا یہ افلاطونی فلسفہ دراصل محبت میں ہارے ہوئے دل کا سہارا بن جاتا ہے:

کوئی سیفو ہو کہ میرا ہو کہ پروین اُسے
راس آتا ہی نہیں چاند نگر میں رہنا

یہی وجہ ہے کہ ''خودکلامی'' میں شامل غزلوں میں باغیانہ تیور کی جگہ خود کو سمجھانے کا انداز ملتا ہے:

اِک نہ اِک روز تو رخصت کرتا
مجھ سے کتنی ہی محبت کرتا

کچھ تو تھی میری خطا ورنہ وہ کیوں
اس طرح ترک رفاقت کرتا

میرے لہجے میں غرور آیا تھا
اس کو حق تھا کہ شکایت کرتا

ترک تعلقات کا کوئی سبب تو تھا
سننے کا میرے دل کو مگر حوصلہ کہاں

پانی دیکھا، نہ زمیں دیکھی نہ موسم دیکھا
بے ثمر ہونے کا الزام شجر پر رکھا

خود احتسابی کے اس دور سے گزرتے ہوئے اکثر بیتی رتوں کا چاند بھی یاد آتا ہے اور دل یہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے:

بات وہ آدھی رات کی رات وہ پورے چاند کی
چاند بھی عین چیت کا اس پہ ترا جمال بھی

جمال یار کا تصور ہی اتنا دل آویز ہے کہ جیسے:

اس کے ہی بازوؤں میں اور اس کو ہی سوچتے رہے

(خود کلامی)

''خود کلامی'' میں اکثر یہ دل آویز سوچ غالب نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

کون چھو کر انھیں گزرا کہ کھلے جاتے ہیں
اتنے سرشار تو پہلے نہ تھے ہونٹوں کے گلاب

(خود کلامی)

شام کی ناسمجھ ہوا پوچھ رہی ہے اک پتا
موج ہوائے کوئے یار، کچھ تو مرا خیال بھی

لیکن یہ سوچ صرف ایک خواب کی مانند ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اور جب آنکھیں کھلتی ہیں تو یہی احساس ستاتا ہے کہ:

خواب کیا دیکھے کوئی نیند کے انجام کے بعد
کس کو جینے کی ہوس، حشر کے ہنگام کے بعد

''خود کلامی'' میں خواب اور حقیقت کے درمیان جھولتی زندگی کے کرب کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

دامن شب کو اگر چاک بھی کرلیں تو کہاں
نور میں ڈوبا ہوا صبح کا آنچل ملنا

زندگی کے کرب کا یہ احساس زمانے کے کرب کا تصور بخشتا ہے۔ اور اُسے محسوس ہوتا ہے کہ نہ صرف اس کی ذاتی زندگی بلکہ، اس کے اردگرد کا پورا ماحول زمانے کی منافقتوں کا شکار ہے۔

طوفان کے جلو میں مری بے بضاعتی
بستی کو دیکھتی کبھی دریا کو دیکھتی

سکوتِ شہر تو پھر بھی سمجھ میں آرہا ہے
پسِ دیوار بھی کیا گریہ وزاری نہیں ہے

جو پیڑ اہل گلستاں کا ستر ڈھکتا رہا
انہی کے ہاتھوں اسے بے لباس بھی دیکھا

کرب وبلا کے ان تجربوں سے گزرتے ہوئے پروین شاکر کو اکثر کربلا کے واقعات سے ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور ایسے میں انھیں درد کو سہنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

اسیر کربلا جب یاد آئیں
کہاں لگتی ہے پھر زنجیر بھاری

پروین شاکر کی غزلوں میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ جن میں واقعات کربلا کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ ''غزل اور کربلا'' کے مصنف ضمیر حسن نے اپنی کتاب میں پروین شاکر کے ان گنت اشعار نقل کئے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی اپنی تصنیف ''کربلا بطور شعری استعارہ'' میں پروین شاکر کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

بہر حال خود کلامی کی غزلوں میں پروین کا درد ذات سے کائنات کی طرف سفر کرتا نظر آتا ہے:

سنتے رہے اخیر تلک مہر و ماہ و نجم
اس خاکداں کا سارا فسانہ عجیب تھا

لیکن کائنات کے درد میں اسے اپنے ہی درد کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ایسے میں ایک بار پھر حیات، ذات و کائنات کے حصار میں رقصاں و گرداں نظر آتی ہے۔

مصحفِ دل پہ عجب رنگوں میں
ایک تصویر بنا کرتی ہے
(انکار)

انھیں تصویروں پر مشتمل ہے۔ چوتھے مجموعہ ''انکار'' کی شاعری جسے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ:

تہہ نشیں پر چاند اُترا اِک پُرانی یاد کا
دل میں پرچم سا کھلا کس قریۂ برباد کا

پرانی یادوں کے چاند سے زندگی کو ضیابار بنانے کی تمنا جا بجا انگڑائی لیتی دکھائی دیتی ہے۔

سج گئی بزم رنگ و نُور ایک نگاہ کے لئے
بام پہ کوئی آگیا زینتِ ماہ کے لئے

رات کی آنکھ میں ہیں ہلکے گلابی ڈورے
نیند سے پلکیں ہوئی جاتی ہیں بھاری اس کی

پیرہن کی اِک جھلک سے بن معطر ہوگیا
جیسے موجِ رنگ میں خوشبو کی کوئی رو بھی ہے

شام بھی روشن ہے کچھ جذب دروں کی ضو بھی ہے
ساتھ اس کے کوہ پر دیدارِ، ماہِ نو بھی ہے

اندھیرے میں بھی مجھے جگمگا گیا ہے کوئی
بس اِک نگاہ سے رنگِ بدن بدلنے لگا

ان اشعار میں ہمیں زندگی کی شام میں یادوں کے اجالے سے روشنی کرنے

کی خواہش دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اسے یہ احساس بھی ستاتا ہے:

میں تو اُڑنا بھول جاؤں زندگی بھر کے لئے
بھر گیا ہے دل مگر مُجھ سے مرے صیاد کا

ایسے میں وہ یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ عشق ناکام سہی زندگی کو ناکامی اور نامرادی کا شکار نہیں بننے دینا چاہئے۔

اس سے ملنا ہی نہیں، دل میں تہیہ کرلیں
وہ خود آئے تو بہت سرد رویہ کرلیں

ظلم سہنا بھی تو ظالم کی حمایت ٹھہرا
خامشی بھی تو ہوئی پشت پناہی کی طرح

اک دل اور اس پہ اتنا ہجوم غم والم
اچھا ہوا کہ ذودِ فراموش ہوگیا

تمام عمر ناکامیوں سے کام لینے کا حوصلہ ان کی شاعری کو ایک نئی توانائی بخشتا ہے اور ایسے میں۔

کبھی کبھی تو دلِ مضطرب یہ چاہتا ہے
کہ چاند رات ہو اور سامنے سمندر ہو

چاند رات میں سمندر کے اندر جو جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی طرح پروین شاکر کی شاعری میں جذبات کا ایک طلاطم شور مچاتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ

ایک جگہ لکھتی ہیں:

''سیلاب رنگ ونور سحر جذبات اور نشۂ خود سپردگی کے زیر اثر وادئی شباب کے نشیب وفراز ہران کہی داستان بے جھجک کہتے کہتے اچانک سحر تنہائی کا شکار ہو کر وادئی حسن وعشق سے نکل کر دشت کرب وبلائے زندگی کی پتھریلی زمیں پر آنکھیں کھولنے اور گویائی واپس کرنے کے بعد پھر ایک بار وہ منظوم کہانی کہنی شروع کردی۔''

یہ کہانی اس لڑکی کی ہے جس کے یہاں ایک زمانے میں خوشبو کے گھر مہمان ہونے کی خواہش کبھی کسی رنگ تو کبھی کسی ترنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر ''صد برگ'' سے گزرتے ہوئے۔ اس کی زندگی میں ایک عجیب قسم کا اکیلاپن اور خلاء کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ ''خود کلامی'' کا سہارا لیتی ہے۔ اور ذات وکائنات کا محاسبہ کرتی ہے۔ حالات سے سمجھوتہ بھی کرنا چاہتی ہے لیکن اسے جواب ''انکار'' میں ملتا ہے۔ اور تب وہ غموں سے نباہ کرنے کا حوصلہ جٹا کر یہ اعلان کرتی ہے کہ :

اس دل میں شوقِ دید زیادہ ہی ہوگیا
اُس آنکھ میں مرے لئے انکار جب سے ہے

اس کا شوق دید اب بدل جاتا ہے ایسے میں اس کے اشعار فرد وسماج کی منافقتوں کے ترجمان بن جاتے ہیں ملاحظہ ہوں یہ اشعار :

اس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

رستے میں مل گیا تو شریکِ سفر نہ جان
جو چھاؤں مہرباں ہوا سے اپنا گھر نہ جان

اب بخیہ گروں میں یہی آئین رفو ہے،
جو زخم سیاجائے ادھورا ہی سیاجائے

مسند کے اتنے پاس نہ جائیں کہ پھر کھلے
وہ بے تعلقی جو مزاجِ شہاں میں ہے

چھت پڑنے کا وقت آیا تو کوئی نہیں آیا
دیوار گرانے کو رضا کار بہت تھے

شعبہ رزق خدا نے جو رکھا اپنے پاس
نائب اللہ بہت بددل و رنجور ہوئے

یہ اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ انکار کی غزلوں میں فکروفن کے حسین امتزاج سے ایک نیا تخلیقی رچاؤ پیدا ہوگیا ہے۔ واقعی ایسا لگتا ہے کہ:

حرف تازہ نئی خوشبو میں لکھا چاہتا ہے
باب اک اور محبت کا کھلا چاہتا ہے

پروین شاکر کو زبان و بیان پر فطری قدرت حاصل تھی۔ زبان و بیان پر بے پناہ دسترس کے ساتھ اُن کے یہاں فکر و نظر کی گہرائی وگیرائی ملتی ہے۔ ان کی

شاعری میں محبت کا جو تصور ملتا ہے۔ اس کی جتنی جہتیں ان کے یہاں ملتی ہیں کہیں اور اس کا تصور بھی محال ہے۔ ان کی شاعری محض نسائی محسوسات تک قید نہیں کہی جا سکتی ان کی شاعری میں پورا انسانی دل دھڑکتا دکھائی دیتا ہے۔

''کفِ آئینہ'' پروین شاکر کا آخری مجموعہ کلام ہے۔ جسے انہوں نے ترتیب تو اپنی زندگی میں دے دیا تھا، لیکن جس کی اشاعت ان کے انتقال کے دو برس بعد عمل میں آئی۔ اس شعری مجموعہ کو پڑھتے وقت بھی احساس ہوتا ہے کہ:

تخت ہے اور کہانی ہے وہی
اور سازش بھی پرانی ہے وہی

ریت ہی ریت ہے اس دل میں مسافر میرے
اور یہ صحرا ترا نقشِ کفِ پا چاہتا ہے

اس مجموعہ میں شامل غزلیں دراصل ذات کی توسیع پر مشتمل ہیں۔ یہاں ذات حیات کا اور حیات ذات کا آئینہ بن کر سامنے نظر آتی ہے:

مجھے تیری محبت نے عجب اِک روشنی بخشی
میں اس دنیا کو اب پہلے سے بہتر دیکھ سکتی ہوں

میرے لبوں پہ مُہر تھی، پر شیشہ رو نے تو
شہر کے شہر کو مرا واقف حال کر دیا

بدلے جاتے ہیں یہاں روز طبیب
اور زخموں کی کہانی ہے وہی

مٹھی میں تو رنگ تھے ہزاروں
بس ہاتھ سے ریت بہہ رہی ہے

یاد آتی ہیں اس کی پیار بھری باتیں شب بھر
اور سارے بدن میں امرت گھولتی رہتی ہیں

اوروں پہ جو لوگ سائباں تھے
بے گھر انھیں کردیا ہے کس نے

ظلم کے ہاتھوں اذیت میں ہے جس طرح حیات
ایسا لگتا ہے اب حشر ہے کچھ دیر کی بات

آستینوں میں چھپائے ہوئے ہر اِک خنجر
اور گفتار کی بابت میں ہیں سب قندونبات

یہ باغباں ہیں کہ گل چیں ندیم یا صیاد
کہ ان سے ہاتھ ملاتے جھجک رہی ہے ہوا

رکھی ہوئی ہے ہر اک گھر کے صحن میں میت
سو وقفے وقفے سے جیسے سسک رہی ہے ہوا

بہر حال ''خوشبو'' سے جس سفر کا آغاز ہوا ''صد برگ'' سے ''خود کلامی'' اور ''پھر انکار'' سے ''کفِ آئینہ'' تک کی منزلیں طے کرتا ہوا ایک ''ماہِ تمام'' کا احساس دلاتا ہے۔ اس پورے سفر کے دوران شاعری کا جو منظر نامہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس میں ایک طرف تو ایک عورت کی نیم جاں حسرتوں، ٹوٹتے بکھرتے خوابوں اور گمشدہ ارمانوں کا ذکر ملتا ہے دوسری طرف مسمار ہوتی ہوئی تہذیب اور اس کے ملبے پر چارو ناچار کھڑے فرد کا ماتم دکھائی دیتا ہے۔ ذاتی اور اجتماعی زندگی کے تلخ وشیریں لمحوں کی آمیزش نے ان کی غزلوں کو دوآتشہ بنادیا ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جو دماغ میں نہیں، دل میں اترتی ہے۔ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ پروین شاکر کی شاعری بھی دل کی آواز ہے۔ جس میں ایک عاشق کے مختلف حیاتی اور نفسیاتی کیفیتوں کا اظہار ملتا ہے۔

ویسے تو عشق غزل کے مزاج کا بنیادی حصّہ ہے لیکن پروین شاکر کے یہاں یہ عشق ذاتی زندگی کی تلخ وشیریں لمحوں کی آمیزش سے دوآتشہ بن گیا ہے۔ اردوٗ غزل کے روایتی عاشق کی جگہ یہاں عاشق ایک عورت ہے۔ اور اس عاشق کے حال دل کا جب بیان ہوتا ہے تو عورت کی وفاداری اس کی قربانی، اس کا جذبہ ایثار سب کچھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ عورت جو اپنے وجود کو قربان کر کے ایک دنیا آباد کرتی ہے، لیکن خود زندگی بھر اکیلی رہ جاتی ہے۔ عورت کی زبان سے عورت کے اس درد کا اظہار پروین شاکر کی شاعری کو نئی معنویت بخشتا ہے۔ عورت کے جذبات کو عورت کی زبان

میں ایک عورت کی طرف سے بیان کرنے کا یہ انداز اردوُ شاعری میں نسائیت اور تانیثیت کے نئے مزاج کو سامنے لاتا ہے۔ اس کے علاوہ واردات ہجر اور امید وصال کا جو سحر انگیز بیان ملتا ہے اور جس طرح سے پروین شاکر نے خاموش جذبوں کو قوتِ گویائی عطا کی ہے وہ اردوُ کی عشقیہ شاعری کے سرمائے میں ایک نہایت منفرد اور خوبصورت اضافہ ہے۔ بقول روبینہ شبنم۔

''اس کی عشقیہ شاعری میں سمندر کی گہرائی اور شہد کی مٹھاس ہے۔ نازک جذبوں کا لوچ اور ہجر کی کسک ہے۔'' (۹)

الفاظ کی شیرینی اور خوش آہنگی، جذبات کی مصوری، احساس کی شیفتگی، انداز کی بے خوفی، بیان کی فریفتگی نے اس کی غزلوں کو رنگین بنا دیا ہے۔ ہر شعر میں گہرا تجربہ، روداد زندگی اور ان سب کو قافئے اور ردیف کی مدد سے پراثر لے میں ڈھال دینے کی صورت ایک نغمگی اور دلنوازی پیدا ہوتی ہے۔ تازگی سادگی پُرکاری اظہار کی برجستگی اور ساختگی پروین شاکر کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

○

حواشی

1۔ پاکستانی اردو ادب اور اہل قلم خواتین، احمد پراچہ، ص ۷۲
۲۔ آزادی کے بعد اردو شاعرات، نجمہ رحمانی، ص ۹۲
۳۔ پاکستان کی اردو شاعرات، رشید امجد، مشمولہ عبارت راولپنڈی، ۱۹۹۷ء
۴۔ عصری ادب خواتین، خصوصی نمبر، نظیر صدیقی، ص ۲۴
۵۔ آزادی کے بعد اردو شاعرات، نجمہ رحمانی، ص ۳
۶۔ دریچۂ گل سے، پروین شاکر، ص ۷
۷۔ رزق ہوا، پروین شاکر، ص ۱۴
۸۔ رزق ہوا، پروین شاکر، ص ۱۲
۹۔ پروین شاکر کی نظمیہ شاعری۔ تنقید و تجزیہ، روبینہ شبنم

پروین شاکر کی نظمیں : ایک تنقیدی جائزہ

پروین شاکر کی غزل گوئی کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ انھوں نے جو کچھ ذاتی طور پر جھیلا اور محسوس کیا ہے۔ اسے اشعار کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ غزل کو عورتوں سے گفتگو کرنے کا فن کہا جاتا ہے۔ اور پروین نے اسے عورت کی گفتگو بنا دیا ہے۔ ایک ایسی عورت کی جو 'میرا' کی طرح عشق میں شرابور ہے۔ اور یہ عشق اسے کبھی اپنے من میں ڈوب کر اور کبھی پیارے پریتم کی پکار بن کر سامنے آتا ہے۔ تو کبھی لذّت وصال سے سرشار نظر آتا ہے لیکن اپنی انتہا پر پہنچ کر ایک جذباتی بحران سے دوچار ہو جاتا ہے۔

ان کی نظم نگاری کے تعلق سے۔ نظیر صدیقی لکھتے ہیں کہ :

> ''غزلوں اور نظموں میں مساوی طور پر اتنی پرزور اور موثر شاعری بڑی مدت کے بعد دیکھنے میں آئی ہے۔''(۱)

واقعہ یہ ہے کہ خوشبو سے 'کفِ آئینہ' تک کے شعری سفر کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ طئے کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے تخلیقی جوہر غزلوں میں زیادہ نکھر کر سامنے آئے ہیں یا پھر نظموں میں؟ یہ فیصلہ تھوڑا مشکل ہے لیکن ہمیں نازک جذبوں کا

وہی لوچ دلوں کی وہی دھڑکن اور خوابوں کے بکھر جانے کی ویسی ہی کسک ان کی نظموں میں موجود نظر آتی ہے جو غزلوں میں ہے۔ خود پروین شاکر ایک جگہ لکھتی ہیں:

"یہ کہانی نئی نہیں ہیں (اور یہی کیا دنیا کی کوئی کہانی نئی نہیں ہے) یہ تو ہمارے اندر کا کہانی کار ہے جو اس کو ایسا سندر بنا دیتا ہے۔"(۲)

دراصل پروین شاکر نے اپنے غزلیہ اشعار میں جن رنگوں کو شعری پیکر میں پیش کیا ہے۔ ان کی تفسیر وتشریح انکی نظموں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اور یہ اس کے اندر کا فنکار ہے، جس نے اس کے اندر کی سندرتا کا احساس جگا دیا ہے۔ ویسے بھی ایک ہی موضوع پر بے شمار لوگ شعر کہتے ہیں، نظمیں لکھتے ہیں، لیکن یہ شاعر کا اندازِ بیان ہی ہوتا ہے جو اسے منفرد بنا دیتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو پروین شاکر کی نظموں میں ہے جو قاری کو ایک نئے پن کا احساس سے دوچار کراتی ہے۔

پروین شاکر نے اپنے مجموعہ خوشبو کے پیش لفظ "دریچۂ گل سے" میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس نے اپنے رب سے یہ دُعا کی تھی کہ اس پر اس کے اندر کی لڑکی کو منکشف کردے۔ یہ انکشاف پروین شاکر کی نظموں میں ایک منظم صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اس انکشاف کے حوالے سے ایک عورت کی پوری شخصیت اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ، بچپن سے سنِ بلوغت تک کا سفر، پھر اس کے بعد اس کی ازدواجی زندگی کے نشیب وفراز، اس کی خوشیاں وسرمستیاں، اس کے دکھ درد، نشاط وصل کی تازہ کاریاں اور ہجرو فراق کی صعوبتیں عشق ومحبت کے معاملات اور ترک تعلق کی پرچھائیاں، اپنے ہم جنسوں سے رشتے وروابط یہاں تک کے جنسی جذبات کا برملا

اظہار اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ماں کے جذبات کا تقدس، غرض کے کئی رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ رنگ برنگے احساسات مل کر ان کی نظموں میں ایک قوس قزح سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔

خوشبو کی پہلی نظم اس الجھن سے شروع ہوتی ہے بقول شاعرہ:

چاند مری کھڑکی پہ دستک دیتا ہے!

(الجھن۔ خوشبو)

اور تب یہ کیفیت سامنے آتی ہے کہ:

پلکوں کی ہلکی سی لرزش
ہونٹوں کی موہوم سی جنبش
گالوں پر رہ رہ کے اترنے والی دھنک
لہو میں چاندرچاتی اس ننھی سی خوشی کا نام نہ لے لے

اس کے بعد اعتراف کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔

اور تب یہ انکشاف ہوتا ہے:

ہونٹ بے بات ہنسے
زلف بے وجہ کھلی
خواب دکھلا کے مجھے
نیند کس سمت چلی

خوشبو لہرائی، مرے کان میں سرگوشی کی

....

....

....

اور پھر جان گئی

میری آنکھوں میں ترے نام کا تارا چمکا!

(کشف)

ایسے میں یہ نوید سنائی دیتی ہے کہ:

سماعتوں کو نوید ہو..... کہ

ہوائیں خوشبو کے گیت لے کر

دریچۂ گل سے آ رہی ہیں!

(نوید)

اور ''خوشبو'' کا یہ گیت شاعری کا مرکزی موضوع بن جاتا ہے

کہ اس کا چہرہ

تمھاری نظموں تمھارے گیتوں کی چلمنوں سے ابھر رہا ہے

(گئے جنم کی صدا)

''پہلے پہل'' ایسا لگتا ہے:

ہوا، چنچل سہیلی کی طرح باہر کھڑی ہے

دیکھتے ہی مسکرائے گی!

مجھے چھو کر تری ہر بات پالے گی

(پہلے پہل)

پھر یہ محسوس ہوتا ہے:

شاخ در شاخ

ایک تیتری، خوشنما پر سمیٹے ہوئے، اڑ رہی ہے

مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے

جیسے مجھ کو بھی پَر مل گئے ہوں!

(دھیان)

اس وقت یہ احساس ہوتا ہے:

پلکوں پہ شفق پھولے

کاجل کی طرح، میری

آنکھوں کی دھنک چھو لے

(اس وقت)

پھر یہ احساس محبت کی سرشاری پیدا کرتا ہے

پھول ہی پھول ہیں

تا بہ حدِ نظر

آتشی، آسمانی، گلابی

کاسنی، چمپئی، ارغوانی

(فلاور شو)

اور تب جذبات کے اظہار کی یہ صورت سامنے آتی ہے:

ترے قلم نے بڑے پیار سے لکھا ہے انہیں

رچی ہوئی ہے ہر اک لفظ میں تری خوشبو

تری وفا کی مہک، تیرے پیار کی خوشبو

زباں کوئی بھی ہو خوشبو کی — وہ بھلی ہوگی!

(خوشبو کی زباں)

اور پھر وہ لمحہ آتا ہے:

ہاتھ اٹھا کر جب آنکھوں ہی آنکھوں میں

اس نے مجھ کو اپنے رب سے مانگا تھا

پھر میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر

کتنے پیار سے میرا ماتھا چوما تھا!

(چاند رات)

اسی لمحے کے ساتھ یہ تصور بھی ابھرتا ہے کہ:

وہی نرم لہجہ

جو اتنا ملائم ہے، جیسے

دھنک گیت بن کر سماعت کو چھونے لگی ہو

شفق نرم کومل سُروں میں کوئی پیار کی بات کہنے چلی ہو

(وہی نرم لہجہ)

اس نرم لہجہ میں جب کسی کی پکار سنائی دیتی ہے تو کیفیت یہ ہوتی ہے:

میں نے شرما کے جھکالیں پلکیں
ایک عجب نشّے کے احساس سے میری آنکھیں
خود بخود بند ہوئی جاتی تھیں

(ردِ عمل)

یہاں تک کہ:

اُس نے میرے ہاتھ میں باندھا
اُجلا کنگن بیلے کا
پہلے پیار سے تھامی کلائی
بعد اس کے ہولے ہولے پہنایا
گہنا پھولوں کا

(کنگن بیلے کا)

اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ:

وقت نے مجھ سے کئی دان لیے
اس کی بانہیں، مری مضبوط پناہیں لے لیں

مجھ تک آتی ہوئی اس سوچ کی راہیں لے لیں

(بائیسویں صلیب)

اور تب سے بس اک ہی آس ہے:

پردیسی کب آؤ گے؟

سورج ڈوبا شام ہوگئی

تن میں چنبیلی پھولی

من میں آگ لگانے والے

میں کب تجھ کو بھولی

کب تک آنکھ چراؤ گے؟

پردیسی، کب آؤ گے؟

(نذر حضرت امیر خسروؒ)

لیکن آس یاس بنتی چلی جاتی ہے:

اُداس شام دریچوں میں مسکراتی ہے

ہوا بھی، دھیمے سُروں میں کوئی اداس سا گیت

میرے قریب سے گزرے، تو گنگناتی ہے

....

....

نہ رنگ ہے، نہ کرن ہے، نہ روشنی، نہ چراغ
نہ تیرا ذکر، نہ تیرا پتہ، نہ تیرا سراغ

(اندیشہ ہائے دُور دراز)

یہاں تک کہ Westeland کی صورت نظر آتی ہے :

صبا کے دونوں ہاتھ خالی ہیں
کہ شہر میں ترا کہیں پتہ نہیں
سانس لینا کس قدر محال ہے!
اُداسیاں۔ اُداسیاں
تمام سبز سایہ دار پیڑوں نے
ترے بغیر وحشتوں میں اپنے پیرہن کو تار تار کر دیا ہے
اب کسی شجر کے جسم پر قبا نہیں
سوکھے زرد پتّے
کُو بہ کُو تری تلاش میں بھٹک رہے ہیں

....

... .

میں ترے بغیر، ''ویسٹ لینڈ'' ہوں!

اب صرف یادیں باقی رہ گئی ہیں :

دُعا تو جانے کون سی تھی

ذہن میں نہیں

بس اتنا یاد ہے

کہ دو ہتھیلیاں ملی ہوئی تھیں

جن میں ایک میری تھی

اور اک تمھاری!

(بس اتنا یاد ہے)

لیکن محبت کی انتہا تو یہ ہے کہ اسکے باوجود یہی خواہش ہے:

ہوا کے ساتھ اُسے یہ پیام بھی پہنچے

کہ تیری عمر خدائے ازل دراز کرے

جو خواب بھی تری آنکھوں میں ہو، وہ پورا ہو

(مری دُعا ترے رخشِ صبا خرام کے نام)

محبوب کی تمام تر رفاقتوں کے باوجود عاشق کی وفا دُعا کی صورت میں اظہار

پاتی ہے:

اسکی شادابیوں کے لئے

میری سب انگلیاں......

ہوا میں دُعا لکھ رہی ہیں (تشکر)

آگے چل کر ''صد برگ'' میں ہمیں یہ احساس ملتا ہے:

کیا کیا دُکھ دل نے پائے
ننھی سی خوشی کے بدلے
ہاں کون سے زخم نہ کھائے
تھوڑی سی ہنسی کے بدلے
زخموں کا کون شمار کرے
یادوں کا کیسے حصار کرے
اور جینا پھر سے عذاب کرے
اس وقت کا کون حساب کرے
وہ وقت.... جو تجھ بن بیت گیا!

(کیکر تے انگور چھڑھایا)

بیتے غموں کا حساب کرنے کے بجائے خوشگوار لمحوں کی یادوں سے زندگی کو روشن کرنے کا جذبہ ''صد برگ'' کی نظموں میں نظر آتا ہے:

زمین اپنے قدیم محور کے گرد رقصاں ہے
اور فضا میں
کسی پُراسرار سرخوشی کا سُرور اس طرح بہہ رہا ہے
کہ جیسے بادِ شمال نے جھوم کر ہرے موسموں کے تن میں

کہیں رگِ تاک کھول دی ہو
اور اب محبت کی اوک سے زندگی کو خوشبو پلا رہی ہے!
نظر سے اوجھل کوئی خوشی ہے
کہ جسم کی پور پور کو چھو رہی ہے آکر

(سپردگی)

ایک اور نظم دیکھئے:

سوچ کے پتھر پہ ایسی ہریالی اُگ آئی ہے
جیسے ان کا اور بارش کا بڑا پرانا ساتھ رہا ہو
ہریالی کے سبز نشے میں ڈوبی خوشبو
میری آنکھیں چوم رہی ہے

(ہنی موون)

ایک اور نظم ''کلام'' کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

نیلے چشموں کی آواز سے بال دھوتی ہوئی شوخ چنچل ہوا
زندگی کی سُہاگن ہنسی
پیڑ، آنگن، دریچے
جسے چوم لے
رنگ سے بیاہ دے!

ایک اور نظم شرارت میں اسی احساس کو ملاحظہ کیجئے:

جھاگ اُڑاتا چشمہ

میرے بال بھگو کر

دور کہیں جا نکلا ہے

لیکن اس کی شوخی اب تک

میری مانگ سے موتی بن کر

قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے!

(شرارت)

''صد برگ'' میں شامل بیشتر نظموں میں یادوں کے دیپک سے دیوالی کا سہانا منظر سامنے آتا ہے۔ دراصل ''خوشبو کی غزلوں میں جو سرشاری ملتی ہے۔ وہ ''صد برگ'' کی غزلوں میں دکھائی نہیں دیتی ہے۔ ناقدین نے اسے ''خوشبو'' سے کمتر درجہ کا بتایا ہے۔ معین الدین عقیل ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''پروین شاکر نے اپنے شعری مجموعے میں جن صلاحیتوں کا اظہار کیا تھا وہ ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''صد برگ'' میں اسی درجہ پر نظر نہیں آتیں۔'' (۳)

بلاشبہ ''خوشبو'' کی غزلوں میں جو سرشاری کی کیفیت ہے وہ ''صد برگ'' کی غزلوں میں موجود نظر نہیں آتی ہے لیکن ''صد برگ'' کی نظموں میں جس طرح سے جذبہ محبت وصال کی تمنا بن کر نشاط وصل کی خواہش سے سرشار نظر آتی ہے۔ اس سے کیسے

انکار کیا جا سکتا ہے:

ہوا کی سرسراہٹ سورۂ اخلاص کی آیت گشا تھی
نصف شب کی نیم خوابیدہ زمیں
گہرے اندھیروں کا تنفّس
اپنی سانسوں سے الجھتے دیکھ کر شرمائی جاتی تھی

(۔۔۔ہوار ہوار تھی میرا)

''..... ہوار ہوار تھی میرا'' کے عنوان سے ''صد برگ'' میں شامل صرف اس نظم کو ہی لیجیے، اس میں کیفیتوں کے حسین امتزاج سے جو پیکر ابھرتا ہے اور سرشاری وسرمستی کا جو سماں بندھتا ہے، وہ پروین شاکر کی شاعرانہ فنکاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اسی طرح سے ان کی نظم ''سپردگی'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اور اب محبت کی اوک سے زندگی کو خوشبو پلا رہی ہے!
نظر سے اوجھل کوئی خوشی ہے
کہ جسم کی پور پور کو چھو رہی ہے آ کر
لہو کی نیلی صداقتوں میں اترنے والی گلابی لذّت
میرا بدن چوُمنے لگی ہے

نظم کا ایک ایک مصرعہ پور پور میں لذت وسرشاری کا احساس کراتا ہے، یہاں تک کہ یہ لذّتیں ''دودھ شہد اور شبنم'' بن کر:

بدن کے سب ذائقوں کو امرت بنا رہی ہے!

''صد برگ'' کی نظموں میں سے بعض نظمیں البتہ گرم موسم کے تلخ ذائقوں کا احساس دلاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''نیرنگ'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جابر حاکم کے دل جیسا
تنگ سیاہ پہاڑ
مظلوموں کی آنکھوں جیسا
ہر پتھر کا سینہ
ہوا چلی اور جاگ اٹھا
کوئی زخم پُرانا
ٹھیس لگی اور پھُوٹ بہا
گرم، رو پہلا چشمہ!

(نیرنگ)

ایک اور نظم شام غریباں کے اشعار ملاحظہ ہوں:

چمکتے نیزوں پہ سارے پیاروں کے سر سجے ہیں
کٹے ہُوئے سر
شکستہ خوابوں سے کیسا پیمان لے رہے ہیں
کہ خالی آنکھوں میں روشنی آتی جا رہی ہے!

(شام غریباں)

ایک اور نظم ادرکنی میں ہمیں کوفۂ عشق میں بے چارگی کا منظر دکھائی دیتا ہے:

کُوفۂ عشق میں

میری بے چارگی

اپنے بالوں سے چہرہ چھپائے ہوئے

ہاتھ باندھے ہوئے

سر جھکائے ہُوئے

زیرِلب ایک ہی اِسم پڑھتی ہُوئی

یا غفوُرالرّحیم!

یا غفُورالرّحیم!

اور پھر حضرت حسین کے آخری الفاظ یاد آتے ہیں ''وَاُوف بِعہدِ کَ''

ملاحظہ ہوں اس نظم کے اشعار:

کنارِ دریا

اب آخری بار رَن پڑا ہے

علم کی نُصرت کو جانے والے وہی جری پاس بج رہے ہیں

کہ جو مری ذُرّیت میں ہیں،

اور جاں سپاری

جنہیں اب وجد سے ورثۂ افتخار بن کر عطا ہوئی ہے!

(وَاُفَ بِعَہدِ کَ)

اور تب یہ احساس ہوتا ہے کہ "ہاں..... ابھی دعائے نور پڑھی جا سکتی ہے:

ہاں — ابھی دُعائے نُور پڑھی جا سکتی ہے
ردِ بلا کے اسم ابھی تک اپنی تاثیروں سے منافق نہیں ہوئے
حرفِ دُعا میں آس کی لَو تابندہ ہے!
ٹوٹنے والی سانسوں کا اک تار
کسی اَن دیکھے مسیحا کے ہاتھوں میں جھول رہا ہے
(ہاں۔ ابھی دُعائے نور پڑھی جا سکتی ہے)

یہ اور اس جیسی نظمیں بھی دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی صدا کی مانند دل میں گھر کر جاتی ہیں۔ خاص طور پر ان نظموں میں الفاظ کا جو Treatment ہے وہ ذات کے کرب کا محاسبہ کرتے ہوئے کائنات کا کرب بھی سامنے لاتا ہے چنانچہ انکی نظم Demonetization کے شعر ملاحظہ ہوں:

قدروں کے نمبر منسوخ ہُوئے
شہر میں کچھ ایسی ٹکسالیں پائی گئی تھیں
جن میں سچ کا چہرہ جھوٹ سے بڑھ کر روشن ڈھلتا تھا
سکّوں کی نیت میں کھوٹ بہت کم ہونے لگا تھا
وقت کی اصل شناس دہکتی بھٹی میں
سونے اور پیتل کی پرکھ اب تک ممکن تھی!

اس طرح ایران ظلِ الٰہی کے پرابلمز ، بارگزیدہ، لمس زر جیسی نظمیں اس حقیقت کی ترجمان ہیں کہ پروین شاکر کی شاعری میں جہاں عشقی حسیّت ملتی ہے وہیں عصری حسیت سے بھی ان کی شاعری بھرپور ہے۔ یہ عصری حسیت فیشن کے طور پر اوپر سے لادی ہوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ شدّت جذبات واحساسات کو موزوں ترین الفاظ کے پیکر میں ڈھل جانے کے سبب پیدا ہوئی ہے۔

''خود کلامی'' انکا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔جس میں شامل نظموں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ :

بے بسی کے رستے پر
کیا عجب دوراہا ہے
ایک سمت بے سمتی
بے چراغ تاریکی
بے لباس ویرانی
بے لحاظ رسوائی
بے سواد قربانی
ہشت پایہ تنہائی
اژدری پذیرائی
گرگ زاد غم خوای

بے کنار روباہی

اور دوسری جانب

قلعہ بند چاہت میں

دل کی آبروریزی!

(چہ کنم)

''خود کلامی'' میں پروین شاکر کی نظمیہ شاعری عورت اور اس کی ذات کے اردگرد طواف کرتی نظر آتی ہے۔ ایک ایسی عورت جو اپنی تمام تر انفرادی شناخت اور حیثیتوں کے باوجود اسے سماجی اقدار مردوں کے زیر دست اور کمزور فطرت کی حامل قرار دیتا ہے۔ خاص طور پر ایک ایسی عورت جو ایک طرف تو اپنی انفرادی صلاحیتوں کو بروئے عمل لاتے ہوئے روائتی فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی میں بھی اپنی مہارتوں کا ثبوت فراہم کررہی ہے لیکن اکثر اس احساس سے دوچار رہتی ہے:

یا تو میں کچھ اور ہُوں

یا پھر

یہ میرا سیارہ نہیں ہے!

(مسفٹ)

ایک فرد کی حیثیت سے عورت کی مرد سے الگ شناخت اس کی ازدواجی

زندگی میں دراڑ پیدا کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس پدر بنیاد دنیا میں اس کی اسے بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے وہ بچہ جو دونوں کی محبت کا امین تھا۔ بغیر باپ کے اپنی زندگی ماں کے ساتھ گذارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور

تب زید نے بکر کو گالی دیتے ہوئے کہا
کہ اسکی ماں
اسکے باپ سے زیادہ مشہور تھی

(نوشتہ)

خود پروین شاکر کو اس المیے سے گذرنا پڑا اور جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ پروین شاکر کی شاعری دراصل ذات کے حوالے سے کائنات کی شناخت کا سمبل بن کر سامنے آتی ہے۔ ''خودکلامی'' کی اکثر نظموں کا لب ولہجہ بھی علامتی ہے مثال کے طور پر ان کے یہاں لفظ بھیڑیے، کا استعمال بار بار ہوا ہے۔ بھیڑیے کی یہ علامت انسانی سماج کے غاصب کرداروں کی نمائندگی کرتا ہے۔

مگر یہ بات گرہ میں باندھ کے رکھ لے
جس جنگل کو تو نے اپنا گھر سمجھا ہے
بھیڑیوں اور ریچھوں سے بھرا پڑا ہوا ہے!

(ایک شاعرہ کے لئے)

کبھی اس کے پس منظر میں اس کے شریک حیات کا چہرہ ابھر کر سامنے آتا

ہے جس کے لئے وہ اپنا سب کچھ قربان کردینے پر آمادہ ہے لیکن وہ اس کی ترقی و
کامیابی سے جلتا ہے۔ وہ ترقی کے سارے راستے بند کر دینا چاہتا ہے اور اسے مکھی
بنا کر اپنی دیوار خواہش سے تاعمر چپکائے رکھنا چاہتا ہے:

وہ مکھی بنا کے مجھے
اپنی دیوارِ خواہش سے تاعمر اس طرح چپکائے رکھے رہے گا
کہ میں
روشنی اور ہوا اور خوشبو کا
ہر ذائقہ اس طرح بھول جاوں گی

(میں تیتری رہنے میں خوش ہوں)

اور اسی لئے وہ کہتی ہے کہ :

بھیڑئے اور ہرن کی دوستی کبھی ممکن نہیں

اور کبھی بے ساختہ یہ پکار اٹھتی ہے :

سو میں تیتری رہنے میں ہی بہت خوش ہوں
گرچہ یہاں
رزق اور جال کی سازشیں بے پنہ ہیں
مگر۔۔۔۔۔۔!
میرے پَرتو سلامت رہیں گے!

(میں تیتری رہنے میں خوش ہوں)

ایسے میں پروین شاکر اپنی مجبوری کو اختیار کا رنگ دے کر محض ظالموں کے شکنجے میں پھنس کر زیردست بنے رہنے کے بجائے یہ چاہتی ہے کہ اگر جنگل میں رہنا ہی اپنا مقدر ہے تو پھر کیوں نہ اپنی مرضی کا ایک جنگل بسا لیا جائے۔ یہ ''اختیار کی ایک کوشش'' ہے

اگر بن میں رہنا مقدر ہے
اور یہ اک طے شدہ امر بھی ہے
کہ ہر بن میں بس بھیڑیے منتظر ہیں مرے
تو یہ سوچتی ہوں
کہ اس صورت حال میں
کیوں نہ پھر
اپنی مرضی کے جنگل میں ہی جا بسوں۔۔۔۔۔۔۔!

(اختیار کی ایک کوشش)

لیکن اپنی مرضی کا جنگل بسانے کے باوجود یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ:

ایک سمت بے سمتی
بے چراغ تاریکی
بے لباس ویرانی
بے لحاظ رسوائی

(چہ کنم)

تنہائی اور اکیلے پن کے اس شدید احساس کو وہ ممتا کے رنگ میں شرابور ہو کر دور کرنا چاہتی ہے۔ جب شوہر نے ساتھ چھوڑ دیا تو پھر بچّے کی موہنی صورت روشن چاند کی مانند آنے والی راتوں کے اندھیروں کو دور کرنے کی امید بن کر سامنے آتی ہے۔ ''جواز'' ''میرا لال'' ''تیری موہنی صورت'' کائنات کے خالق'' اور ''نوشتہ'' ایسی نظمیں ہیں جہاں عورت اپنے جینے کا جواز بچّے کی صورت میں ڈھونڈ لیتی ہے۔

ہاں مجھے نہیں پروا
اب کسی اندھیرے کی
آنے والی راتوں کے
سب اُداس رستوں پر
ایک چاند روشن ہے
تیری موہنی صورت!

(تیری موہنی صورت)

بچّے کی صورت میں جو چاند روشن ہے وہ اکثر بیتی یادوں کے چراغ بھی روشن کر دیتا ہے اور تب محسوس ہوتا ہے کہ

زندگی اس جنوں خیز بارش کے شانوں پر سر کو رکھے
رقص کرتی ہے

ازدواجی زندگی کے رشتوں کی سنہری یادوں میں وہ گُم ہو جانا چاہتی ہے۔

ہاں ــــــ! یہ موسم تو وہ ہے

کہ جس میں نظر چُپ رہے
اور بدن بات کرتا رہے
اُس کے ہاتھوں کے شبنم پیالوں میں
چہرہ مرا
پھول کی طرح ہلکورے لیتا رہے
پنکھڑی پنکھڑی
اُس کے بوسوں کی بارش میں
پیہم نکھرتی رہے

(سرشاری)

ایسے میں تجدید وفا کی خواہش بھی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن پھر یہ احساس غالب آجاتا ہے کہ :

ہم سفر چھوٹ گئے راہ گزر کے ہمراہ
کوئی منظر نہ چلا دیدہ تر کے ہمراہ

چنانچہ پروین شاکر کے چوتھے مجموعہ میں ہماری ملاقات ایک ایسی عورت سے ہوتی ہے جو تجدید وفا کے احساس کی تشنگی لئے جی رہی ہے۔

اک آواز برابر گریہ کرتی ہے
مجھے نکالو!
مجھے نکالو!

(ایک دفنائی ہوئی آواز)

ازدواجی تجربات و کیفیات کی یاد اُسے بے چین رکھتی ہے۔

تادیر میں سوچتی رہی تھی

کس ابرِ گریز پا کی خاطر

میں کیسے شجر سے کٹ گئی تھی

کس چھاؤں کو ترک کر دیا تھا

(۔۔۔۔۔لیکن بڑی دیر ہو چکی تھی)

ایک اور نظم ''نشاطِ غم'' میں تجدید ملاقات کا یہ احساس غالب نظر آتا ہے جب وہ یورپ کے نہایت دور افتادہ علاقے میں تنہا بیٹھی اعلان سفر کی منتظر تھی کہ اچانک کسی نے اس سے پوچھ ڈالا تھا کہ اپ اکیلی ہیں وہ پُر کشش لڑکا اپ کا ساتھی کہاں ہے اور تب وہ یہ کہتی دکھائی دیتی ہے :

میرا دل دُکھ سے کیسا بھر گیا تھا

مگر تہہ میں خوشی کی لہر بھی تھی

پرانے لوگ ابھی بھولے نہیں ہم کو

ہمیں بچھڑے، اگرچہ

آج سولہ سال تو ہونے کو آئے!

(نشاطِ غم)

''انکار'' میں شامل بیشتر نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے، کہ دائمی شکست اور تشنگی عورت کا مقدر ہے۔ لیکن پروین شاکر اس کے باوجود اپنے دل میں

فطرت کے حُسن اور جمالِ یار کے تصور سے رنگ ونور بھرنے کی کوشش کرتی ہے۔
محبوب کی یادوں سے دل کے حُجرہ تاریک کو منور کر لینا چاہتی ہے۔

چنانچہ اظہار کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ جمالیاتی کیف و سرشاری سے
بھرا ہے ملاحظہ ہوں چند نظم کے کچھ مصرعے :

(۱) پُورے چاند کی شب ہے
زمیں سے آسماں تک
روشنی کی ایک سیڑھی بن گئی ہے
مرے تن پر ستاروں سے بنا ملبوس ہے
اک ہاتھ میں تازہ گلاب
اور دوسرے میں تیرا بازو ہے

(سفرِ خواب)

(۲) رُوح کا دامن کھینچ رہی تھی
تیرے پیراہن کی آنچ
میرے اور بارش کے لبوں پر
کھیل رہی تھی
ایک ہی بات
تیرے ہونٹ، تری پیشانی، ترے ہات!

(ایک شریر نظم)

نظموں کے یہ اقتباسات اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ پروین شاکر سنہرے خوابوں میں کھو جانے اور تلخ حقیقتوں کو بھول کر نئے حوصلہ کے ساتھ جینے کی آرزو لئے اپنا سفر حیات طئے کرنا چاہتی ہیں، شاید اسی لئے اس شعری مجموعہ کا نام انھوں نے ''انکار'' رکھا ہے۔ زندگی کی تلخیوں کا انکار کرتے ہوئے مثبت حوصلے کے ساتھ جینے کی خواہش کے احساس سے بھرپور اس مجموعہ میں کئی نظمیں ایسی مل جاتی ہیں جس میں زندگی کے جمال پرور تصور کو گرفت میں لیا گیا ہے۔ ''بہار اپنی بہار پر ہے'' ''ایک منظر''، ''ایک پیغام''، ''نیاگرہ فالز'' جیسی نظمیں حوالے کے لئے دی جا سکتی ہیں۔ فطرت کے منظر کو پس منظر بنا کر اپنی زندگی کے تجربات و واقعات اور اپنی یادداشت کو مہمیز کرنے کا عمل ''انکار'' کی نظموں میں ایک دل آویزی پیدا کر دیتا ہے۔

ان نظموں کی خوبی نظم کی جمالیاتی تشکیل و تنظیم ہے جو پروین شاکر کے شعری اسلوب کا تشخص قائم کرتی ہے۔ احساس جمال پروین شاکر کی شاعری کی روح بن کر شروع سے آخر تک ہر مجموعہ کلام میں نظر آتا ہے۔

جس طرح پہلا مجموعہ ''خوشبو'' خوشبوؤں کے سفر پر مبنی ہے۔ اور ''انکار'' خوابوں کے سفر کا اشاریہ ہے، تلخ حقیقتوں کو بھول کر نئی زندگی کی تعمیر کا خواب، لیکن زندگی کی تعمیر نو کا یہ سفر طئے کرتے ہوئے وہ ایک ''حبس'' کے احساس سے بھی گذرتی ہیں :

حبس بہت ہے
اشکوں سے یوں آنچل گیلے کر کے ہم

دل پر کب تک ہوا کریں

باغ کے دَر پہ قفل پڑا ہے

اور خوشبو کے ہاتھ بندھے ہیں

کِسے صدا دیں

لفظ سے معنی بچھڑ چکے ہیں

لوگ پُرانے اُجڑ چکے ہیں

نابینا قانوں وطن میں جاری ہے

(حبس بہت ہے)

''حبس'' کا یہ احساس دراصل ان سیاسی اور سماجی حالات کے سبب ہے جو زندگی کی تعمیر نو کے راستے میں حائل ہیں۔ ''انکار'' میں ایسی کئی نظمیں مل جاتی ہیں جن میں سیاسی حالات وواقعات کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

تو تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے

کہ ایسے موقعوں پر

دریا اپنا جغرافیہ تبدیل کر لیتے ہیں!

(سندھو دریا کی محبّت میں ایک نظم)

لیکن پروین شاکر کی شاعری کا جغرافیہ نہیں بدلتا۔ خوشبو کی جو دھارا بہنا شروع ہوتی ہے وہ زندگی کو ''صد برگ'' بناتی ہوئی ''خود کلامی'' سے گزرتے ہوئے

''انکار'' تک پہنچتے پہنچتے رنگ و نور سے شرابور نظر آتی ہے۔

ملاحظہ ہوں انکار کی ایک نظم:

کہیں قبائے شجر گلابی سی ہو گئی ہے
کہیں ہرے پیڑ زرد، نارنج چادریں اوڑھنے لگے ہیں
کہیں فقط قرمزی سی اک روشنی درختوں پہ اپنا ہالہ کئے ہوئے ہے
کہیں پہ کنجِ چمن شہابی دِیوں کی لو سے دمک اُٹھا ہے
کہیں پہ جیسے زمرّدیں شاخسار پر لعل کِھل اٹھے ہیں
فضا میں یاقوت بہہ رہا ہے

(بہار اپنی بہار پر ہے)

پوری نظم پڑھتے ہوئے واقعی احساس ہوتا ہے کہ فضا میں یاقوت بہہ رہا ہے۔ فطرت کے حسن و جمال کو لفظوں میں قید کرنے کا ہنر پروین کی شاعری کو نئی پہچان دیتا ہے۔ تراکیب الفاظ اور استعارہ در استعارہ کا تخلیقی استعمال پروین شاکر کی شناخت ہے۔

''چاند کی روشنی میں لکھی گئیں دو نظمیں'' اور ''I'LL MISS YOU'' جیسی مختصر ترین نظموں کو پڑھتے ہوئے قاری کے اندر واقعی یہ احساس بیدار ہوتا ہے کہ جیسے۔

سارا سفر خوشبو میں بسا رہا!

خوشبوؤں کا سفر طے کرتے ہوئے یہ صورت حال بھی سامنے آتی ہے:

جس دن درخت سے پہلا پتّہ گرا

میں اسے اٹھانے کے لئے جھکی

پلٹ کر دیکھا

تو وہ جا چکا تھا!

اب میں ٹوٹے ہوئے پتّوں میں

اپنے آنسو جمع کر رہی ہوں

مجھے جان لینا چاہئے تھا

کہ اس کا اور میرا ساتھ

موسمِ بہار تک ہے!

(مجھے جان لینا چاہیئے تھا)

محبوب کی رفاقتوں اور قربتوں کی بہار کے ختم ہونے کا احساس ''انکار'' کی اکثر نظموں میں نمایاں ہے جو پروین کی زندگی کی وہ حقیقت ہے جس سے آنکھ چرا کر گزرنے کی لاکھ کوشش کے باوجود اس کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

''کفِ آئینہ'' پروین شاکر کا آخری شعری مجموعہ ہے جو ان کے سفرِ آخرت کے بعد منظرِ عام پر آیا ہے۔ اسے ان کی بہن نے شائع کیا لیکن اس کا نام خود پروین شاکر کا ہی رکھا ہوا ہے۔ پورا مجموعہ پروین شاکر کے اس احساس پر مبنی ہے:

پت جھڑ سے ہے گلہ نہ شکایت ہوا سے ہے

پھولوں کو کچھ عجیب محبت ہوا سے ہے

ہوا کے جھونکے پھول کی پتّیوں کو اکثر بکھیر دیتی ہیں لیکن یہ ہوا ہی ہے جو پھول کی خوشبو کو دور تک لے جاتی ہے۔ تقریباً اسی احساس کی نمائندگی کرتی ہیں اس مجموعہ میں شامل نظمیں۔ ایک طرف تو یہ احساس کہ:

تمہارے ساتھ نے تو روح کا موسم بدل ڈالا
یہاں اب رنگ کا تہوار ہے
خوشبو کا میلہ ہے
مرا ملبوس اب گہرا گلابی ہے
مرے خوابوں کا چہرہ ماہتابی ہے
مرے ہاتھوں کی حدّت آفتابی ہے
جسے چھوکر............

(یہ میرے ہاتھ کی گرمی)

یا پھر نئے سرے سے جینے کی تمنا لئے ہوئے یہ احساس کہ:

یہ بارش خوبصورت ہے
اک عرصے بعد
میری روح میں
سیراب ہونے کی تمنا جاگ اٹھی ہے

(نظم)

اور دوسری طرف یہ کیفیت کہ:

زمیں پر ہوں اور میں نہ زیرِ فلک
نہ دھڑکا ہے دل کو نہ کوئی کسک
ترے ساتھ ہوں اور نہ تیرے بغیر
جئے جا رہی ہوں میں اپنے بغیر

(یہ کیسا خلا ہے)

ایک طرف ماضی کی یادوں کے سہارے جینے کا حوصلہ کہ:

تمہارے جانے کے بعد میں نے
وہ شام آنچل میں باندھ لی
اور اس کی خوشبو کے ساتھ
باقی تمام شب اس طرح بسر کی
کہ جیسے بارش کے بازوؤں میں
بہار کی اوّلین کونپل (ایک نظم)

اور دوسری طرف یہ نظارہ ہے:

میں باہر کی تمازت سے
جھلس کر آئی تو دیکھا
مرے گھر میں بھی ویسی دھوپ میری منتظر تھی!

(ایک خالی دوپہر)

''کفِ آئینہ'' کی نظموں کے تعلق سے خود انکی نظم ''سیمیا'' کے الفاظ کافی ہیں:

چارہ گر حیران ہے!
تپ سے تن جھلسا ہوا
نبض نا ہموار، دل ڈوبا ہوا
ضعف سے سر اک طرف
زخم سارے تازہ رو
پھر بھی چہرہ پھول کی صورت مرا شاداب ہے!

پروین شاکر کی پوری شاعری دراصل اسی صورتحال کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی لہجے کی نغمگی، الفاظ کی ترتیب، بیان کی موزونیت، تراکیب کا حسن لہجے پروین کی نظموں کو ایک نئے آہنگ، اور نئے مزاج، سے روشناس کراتی ہے انھوں نے جو دُعا مانگی تھی قدرت نے ان کی اس دُعا کو لفظ بہ لفظ قبول کرلیا

یارب مرے سکوت کو نغمہ سرائی دے
زخم ہنر کو حوصلہ لب کشائی دے
دل کو لہو کروں تو کوئی نقش بن سکے
تو مجھ کو کربِ ذات کی سچّی کمائی دے

○

حواشی

۱ عصری ادب خواتین، خصوصی نمبر
۲ 'دریچۂ گل سے'، پروین شاکر
۳ پاکستان میں اردو غزل، مکتبہ ابلاغ (طارق منزل)

پروین شاکر کی شاعری میں "عورت"

یوں تو اردو کے شعری منظرنامے میں پروین شاکر کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ تاثر عام ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں نسوانی جذبات کی ترجمانی بہت بے باکی سے کی ہے۔ اور یہ بات اعتراض کے طور پر کہا جاتا ہے کہ پروین شاکر کے یہاں کم سن لڑکیوں کے ناپختہ جذبات کا اظہار شدت کے ساتھ ملتا ہے اور ان کی شاعری محض نسوانی جذبات کے اظہار تک محدود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پروین شاکر کی تمام تخلیقات میں "خوشبو" کی شاعری نوخیز اور نوعمر لڑکیوں کے عشقیہ جذبات اور احساسات کا عکاس ہے۔ لیکن پروین شاکر نے اپنی سبھی شعری مجموعے میں عورت کو بیدار رکھا ہے۔ ان کے یہاں عورت کی پوری شخصیت اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ بچپن سے لے کر سنِ بلوغیت تک کا سفر اور پھر اس کے بعد اس کی ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز، اس کی خوشیاں سرمستیاں اور اس کے دکھ درد، نشاط وصل کی تازہ کاریاں اور ہجر و فراق کی صعوبتیں، عشق محبت کے معالات اور ترک تعلقات کی پرچھائیاں، اپنے ہم جنسوں سے رشتے و روابط یہاں تک کے جنسی جذبات کا برملا اظہار، غرض کہ ان تمام باتوں کا اظہار جو عورت سے متعلق ہیں پروین شاکر کے حصار

شاعری میں محصور ہو جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے کے دوران یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے معمولی سے معمولی جذبات کی ترجمانی میں بھی فنی ہنر مندی کے استعمال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ زبان و بیان کی پختگی کا اندازہ ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اردو شاعری میں عشق و محبت کے واقعات کو بیان کرنے کی روایت اس وقت سے ہے جب غزل کا وجود ہوا، جیسا کہ غزل کا مطلب عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا ہے، عورتوں کی باتیں کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اردو شاعرات میں پروین شاکر میں یہ خوبی ہے کہ وہ بھی عورتوں کی باتیں کرتی ہیں، لیکن یہاں عورتوں کی باتوں سے مراد عورت کے قد و قامت، اس کے زلف رخسار، اس کے لب و نین کا صرف تذکرہ نہیں ہوتا بلکہ ایک تہہ داری ہوتی ہے جو عورت کے جذبات اور اس کی زندگی کے ہر پہلو کو خود میں سموئے ہوئے ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مرد عورت کے باہمی رشتوں کے کئی رنگ دکھائے ہیں۔

پروین شاکر کی غزلیں ہوں یا نظمیں ہمیشہ انہوں نے مشرقی تہذیب کی نمائندگی کی ہے اور شاعری میں محبوب کے جذبات کا احترام قائم رکھتے ہوئے اسے ایک نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ انہوں نے نئے زمانے اور نئی سوچ پر مبنی مشرق اور اس مشرق کے نسائی کردار کے احساسات و جذبات کو باقاعدہ طور پر اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں امجد اسلام امجد نے صحیح لکھا ہے:

''اردو ادب میں سچے نسائی محسوسات اور جذبوں کی شاعری بہت کم ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری شاعرات نے آنکھ بند کر کے اردو زبان اور شاعری کے مروجہ آہنگ کی پیروی کی ہے۔ پروین شاکر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی خوب صورت، نرم و نازک فوارے کی طرح اُبھرتی اور پھسلتی ہوئی شاعری کے ذریعہ اردو ادب کے شعری اسالیب میں نئی جہت کا اضافہ کیا۔''

پروین شاکر شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حساس عورت بھی تھیں جو تجربات کی کئی منزلوں سے گزر چکی تھیں۔ اسی لیے ان کے یہاں ازدواجی الجھنوں کا کھل کر اظہار ملتا ہے۔ شریک حیات کے ساتھ بھی تنہائی کا خوف اور تشنگی کا احساس صرف ان کی اپنی زندگی کا بیان نہیں بلکہ تمام نسوانیت کی داستان ہے۔ ریاکاری، مکاری، ظاہرداری پر بھی اشعار ملتے ہیں۔ جہاں وہ مختصر الفاظ میں بہت بڑی بات کہہ جاتی ہیں جس کی تفسیر پر قاری سر دھنتے ہیں۔ ایک ایسی ہی مختصر ترین نظم ''مقدر'' ہے، جس میں وہ کہتی ہیں:

میں وہ لڑکی ہوں
جس کو پہلی رات
کوئی گھونگھٹ اٹھا کے کہہ دے
میرا سب کچھ تیرا ہے دل کے سوا

پروین شاکر نے اپنی نظمیہ شاعری کے ذریعہ خواتین کے مسائل کو بخوبی پیش کیا ہے۔ اس کے شعری مجموعے ''خوشبو'' میں بھی ہم اس بات کو محسوس کر چکے ہیں کہ

مرد سوسائٹی میں، اپنی بالادستی کے باعث عورت کو زیردست رکھتا آیا ہے۔ اس کے احساس برتری نے ہمیشہ عورت کو احساس کمتری میں مبتلا رکھا۔ پروین شاکر نے اپنی نظموں کے ذریعے عورت کی مظلومیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے یہاں کسی ایسے شعری کردار کی تشکیل ہوتی نظر نہیں آتی جو مرد سے مساوات کا دعویٰ کرتے ہوئے اپنے حقوق بھی طلب کرے کہیں کہیں اس فکر کے جگنو روشن ہوتے نظر تو آتے ہیں اور ان کی چمک میں روشنی تو ہوتی ہے لیکن حرارت نہیں ہوتی۔

"خوشبو" میں جہاں ایسی نظمیں ہمارے مطالعے میں آتی ہیں جو سوانحی یعنی پروین شاکر کی زندگی کے واقعات سے مربوط ہیں وہیں اسی مجموعے میں ایسی نظمیں بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں جن کا تعلق عورت کے سماجی مسائل سے ہے۔ سماج میں عورت کا کیا مقام ہے؟ فطری طور پر اس کی نفسیات کیا ہیں؟ زندگی کے بنتے ٹوٹتے دائروں میں اس کے رشتوں کی کیا اہمیت ہے؟ اس کی زندگی کے روز و شب کس نوعیت کی علمی، تہذیبی، مذہبی اور سماجی جذبوں کی تفسیر کرتے ہیں؟ چونکہ پروین شاکر خود عورت ہے اس لیے عورت کے جذبات کو اس کے احساسات کو، اس کے دل کی دھڑکنوں کو اور اس کی نفسیات کو بخوبی سمجھتی ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ ہر عورت مریم، زلیخا اور سیتا ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عورت چاہے کوئی بھی نام رکھتی ہو نسلِ آدم کو پروان چڑھانے میں اس کا اہم کردار ہے۔ بقول ساحرؔ وہ خود اوتار پیمبروں کو جنم دیتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ عورت کو سماج میں وہ مقام کبھی میسر نہیں ہوا۔ جس کی وہ حقدار تھی۔

اس سے برابری کا سلوک تو کجا اس کے برخلاف صنفِ نازک کی حیثیت سے اس کو ہمیشہ دبایا گیا۔ سماج کے بدلتے ہوئے اقدار اور زندگی کے تغیر پذیر معیاروں میں چاہے اس کا رول جس قسم کا بھی رہا مرد نے عورت کو کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ عورت سے متعلق دانشوروں، مفکروں اور فلسفیوں نے بہت کچھ لکھا لیکن یہ معمہ کوئی حل نہیں کر پایا۔

پروین شاکر کی زندگی کے اشارے صاف واضح کرتے ہیں کہ بحیثیت ایک عورت ازدواجی بندھنوں میں اسے وہ محبت اور وفا نہیں مل سکی جس کی وہ متمنی تھی۔ اس کی نظمیہ اور غزلیہ شاعری سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مرد کو ہرجائی ظالم اور بے وفا کے روپ میں دیکھتی ہے۔ مرد کے متعلق اس کی رائے شوہر کی بے توجہی کے باعث بھی ہوسکتی، جسے اس نے کھل کر اپنے کلام میں دوٹوک پیش کیا ہے، لیکن عام مردوں کے متعلق اس کے شک وشبہات یقیناً ان مسائل کی بدولت ہیں جو عورتوں کو سماج میں پیش آتے ہیں۔

پروین شاکر کی شخصیت اور شاعری کے پس منظر میں اسی خیال کی تائید بار بار اس کی شعری مجموعوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شوہر پرست بھی واقع ہوئی ہے۔ اس کے خیال میں عورت کو بھی اسی طرح محسوس کیا جائے جس طرح مرد کو محسوس کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ کوئی بے جان مورت نہیں، سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ایک انسان ہے جو دیکھتی، سوچتی اور محسوس کرتی ہے اسے

اپنے وجود کا خود بھی احساس ہوتا ہے۔ عورت عورت ہوتی ہے اپنی صنف اور فطرت میں ایک مکمل شخصیت اور اسے ایک انسان کی حیثیت سے ہی جانا پہچانا جا سکتا ہے۔ باخبر ہونے کے لیے تو ہم ہر چیز سے باخبر ہوتے ہیں جیسے زمینِ آسمان، درخت، پہاڑ، چاند، ستارے، یہ جاننا ان چیزوں کا ہے جن کے جذبات نہیں ہوتے۔ عورت کوئی چیز نہیں ایک ذی حیات باشعور پیکر ہے۔ پروین نے اپنی شعری تخلیقات کے ذریعے یہ احساس اپنے محبوب کے توسط سے مردوں کو دلایا ہے۔

پروین شاکر نے اپنے شعروں میں عورت کے وجود کا ایک ایسا تصویر پیش کیا ہے جو شادی کر کے معاشی سہارا تلاش نہیں کرتی بلکہ ازدواجی زندگی اس کے لیے فطری، جذباتی اور سماجی ضرورت ہے۔ شادی کی سماجی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے شعری رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورت کو اس کے وجود کا احساس دلاتے ہوئے اس کی زندگی کی معنویت کو اجاگر کرنا چاہتی ہے۔ عورت کے لئے مناسب نہیں کہ جب وہ ظالم مرد کے پنجے میں پھنس جائے تو طرح طرح کے مظالم برداشت کرتی رہے۔ عورت کوئی بے جان شئے نہیں ہے زندگی کو جئے جانے کا حق اسے بھی فطرت نے اتنا ہی عطا کیا ہے جتنا ایک مرد کو پروین چاہتی ہے کہ مرد عورت کا ایک بہترین رفیق ہو اور اس کے دل میں عورت کے لئے مساوات، آزادی، اور انسان دوستی کے سارے جذبے موجود ہوں۔ اس کی نظر میں عورت عام طور سے پیدائشی بدنصیب اور مظلوم نہیں ہے بلکہ مرد کے منافقانہ رویے کے باعث وہ ایسے مقام پر پہنچتی

ہوئی نظر آتی ہے۔

پروین شاکر کے یہاں شوہر پرستی کے جن جذبات کا اظہار بار بار کیا گیا ہے وہ انفرادی نہیں۔ مشرقی خواتین کے لئے شوہر کا مرتبہ خدا کی عبادت کے بعد سب سے بڑا ہے۔ مشرقی عورت کا یہ ایمان بھی ہوتا ہے کہ شوہر کے محبت بھرے لمس کی طاقت ہی عورت کو جینے کا سہارا دیتی ہے۔ پروین کی شاعری میں ازدواجی رشتے کے تناظر میں عورت کا تصور ایک ایسا تصور ہے جس میں عورت اول بھی عورت آخر بھی۔ پروین کی شاعری میں بطور خاص ''خوشبو'' کے حوالے سے ایک نوعمر لڑکی کے رومان اور جذبات کا بیان ہے اس نے اپنی ذاتی زندگی کے تجربات کو گہری فکر اور وسیع تخیل میں سمو کر عورت کی دلی کیفیت کا انکشاف کیا ہے۔ اس کے یہاں یہ جذبہ بار بار ابھرتا دکھائی دیتا ہے کہ وہ نہ صرف چاہے جانے کی آرزو کرتی ہے۔ بلکہ اپنے محبوب سے زبانی طور پر بھی اس کا اظہار چاہتی ہے۔ اس کے شعری ارتقاء کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ پروین شاکر کی شاعری شباب کی منزلوں میں قدم رکھنے والی لڑکی اور پھر اس کے بعد ازدواجی زندگی کی بندھنوں میں بندھنے والی عورت کی کہانی ہے۔ اس کے نظمیہ وغزلیہ تخلیقات میں نئی پود کو ایک شعوری پیغام دینے کا عمل ہے۔

پروین شاکر خواتین شاعرات میں اپنے منفرد لب و لہجے اور عورتوں کے نفسیاتی مسائل کو پیش کرنے کے باعث اردو شاعری کو ایک نئی جہت دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے باک لہجہ استعمال کرتی ہے

اور انتہائی جرأت کے ساتھ جبر وتشدد کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں جو اپنے حقوق پر شرم وحیا کے دبیز اور تہہ دار پردے ڈال دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پروین کے موضوعات شعری کچھ مخصوص ہیں لیکن قاری کے لئے اس کی شاعری میں، اس کی ہیئت، نغمگی، موزونیت، الفاظ کی ترتیب، انکا خوشگوار استعمال، تراکیب، پیکر تراشی، انداز بیان کو ابھارنے کی طاقت مجموعی طور پر توجہ کی چیز ہے۔

عورت جسے اُمّ القصص کہا جاتا ہے داستانوں، ناولوں اور افسانوں میں مرکزی حیثیت پا گئی اور غزل کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے کہ غزل عورتوں کے بارے میں بات چیت یا گفتگو ہے اس لیے غزل کا مرکزی خیال یا تصور عورت ہی ہے۔ تمام تشبیہیں، استعارے اور علامتیں عورت کی شخصیت کو ابھارنے کے لیے استعمال میں لائی گئیں اور پسلی سے نکلی ہوئی عورت مرد کے احساسات و جذبات کی مرکز بن گئی۔ آہستہ آہستہ عورت اپنی شناخت کھوجتی ہوئی اور اپنے کو مرد سے الگ ایک اکائی یا وحدت کے روپ میں دیکھنے لگی۔ اس وحدت احساس نے عورت کو معاشی طور پر آمدنی کے ذریعہ ڈھونڈ نکالنے کی ترغیب دی اور اس نے مرد کی بنائی ہوئی قدروں کے جال سے باہر نکل آنے کی تگ و دو شروع کی۔

پروین کی غزلوں میں ہجر وصال کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے۔ "صد برگ" اور "خود کلامی" کے شعروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے یہاں دوست کی محرومی کا احساس زیادہ ہے اور یہی احساس اس کی غزلیہ شاعری میں درد وغم کی ایک فضا تشکیل

کرتا ہے حالانکہ قرب کی آسائش اور وصل کی ساعت بھی اس کے مقدر میں ہے۔ لیکن یہ لمحوں کی صورت تیزی کے ساتھ گزر جاتی ہے۔

زندگی کی کوئی محرومی نہیں یاد آئی
جب تلک ہم تھے ترے قرب کی آسائش میں

ایک مرد کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنے ہمسفر سے خفا ہو کر تنہا رہے لیکن ایک عورت کے لئے اپنے شریکِ حیات سے بچھڑ کر رہنا انتہائی اندوہناک ہے اس لئے کہ جس گھر میں وہ اپنی زندگی کے دن گزارتی ہے وہاں اس کے لئے کوئی ایسا تو ہو جس کے لئے وہ اپنی آنکھوں میں خواب بسائے، سپنے دیکھے، اس کے انتظار میں اپنی آنکھیں بچھائے لیکن تنہائی کے عالم میں دل کا چراغ تو شام ہی سے بجھنے لگتا ہے۔

آسان سہی بچھڑ کے رہنا
پر اس کا سا دل کہاں سے لائیں

شام ہونے کو ہے اور آنکھ میں اک خواب نہیں
کوئی اس گھر میں نہیں روشنی کرنے والا

شب تنہائی اور ہجر کی رات کبھی مختصر نہیں ہوتی۔ اس رات کی صبح کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ہاں کچھ آنسو ہی آنکھوں میں رہ جاتے ہیں جن کے بہہ جانے سے شاید درد جدائی کم ہو سکے۔

میں ہجر کے عذاب سے انجان بھی نہ تھی
پر کیا ہوا کہ صبح تلک جان بھی نہ تھی

روتی رہی اگر، تو میں مجبور تھی بہت
وہ رات کاٹنی کوئی آسان بھی نہ تھی

اس کے وصل کی ساعت ہم پہ آئی تو جانا
کس گھڑی کو کہتے ہیں خواب میں بسر ہونا

پروین کا فنِ شاعری عورت کے نفسیات کا فن ہے۔ روح کی تڑپ درد، قربت میں دوری کا اذیت ناک تصور، تنہائی کا کرب اور بہت کچھ پا لینے کے بعد بھی سب کچھ کھو دینے کا احساس، انہیں سب نے مل کر داستانِ محبت کے پلاٹ کی تشکیل کی ہے۔ جس میں ایک انوکھی چیز ہے عشق کا منفی تصور ہے۔ اس کہانی کے ہیرو ہیروئن اپنے دلوں میں بھلے ہی ایک دوسرے کے لئے نرم گوشے رکھیں لیکن بظاہر ایک دوسرے کے لئے نظریاتی اختلاف میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ دل کی 'ہاں' زبان کی 'نا' بن کر ہی نکلتی ہے۔ یہ دونوں کردار ایک دوسرے کے ساتھ نازک رشتے میں بندھے نظر آتے ہیں اس کے باوجود ان میں آپسی خلوص و محبت، مہر و وفا اور عزت و احترام کے جذبات کی کمی ان کی زندگی کو خوشگوار نہیں بنا سکی۔

وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

صبح میرے جوڑے کی ہر کلی سلامت تھی
گونجتا تھا خوشبو میں رات بھر کا سناٹا

وہ شہر چھوڑ کے جانا تو کب سے چاہتا تھا
یہ نوکری کا بلاوا تو اک بہانہ ہوا

کسے بلاتی ہیں آنگن کی چمپئی شامیں
اپنے نئے گھر میں بھی پُرانا ہوا کہ وہ اب

ایک اک کر کے مجھے چھوڑ گئیں سب سکھیاں
آج میں خود کو تری یاد میں تنہا دیکھوں

اجنبی لوگوں میں ہو تم، اور اتنی دور ہو
ایک اُلجھن سی رہا کرتی ہے روزانہ ہمیں

آنگنوں میں اُترا ہے بام و در کا سناٹا
میرے دل پہ چھایا ہے میرے گھر کا سناٹا

مل کے اُس شخص سے میں لاکھ خموشی سے چلوں
بول اُٹھتی ہے نظر پاؤں کی چھاگل کی طرح

ہمارے معاشرے میں مردوں کے جبر و استحصال کے اتنے رنگ اور اتنے انداز ہیں کہ ان کی گنتی نہیں کی جاسکتی۔ لڑکیوں کی پسند ناپسند، ان کے جذبات و احساسات اور

معاملات میں ان کی رائے اور نقطۂ نظر کو اہمیت نہیں دی جاتی ۔ یہ سلسلہ شروع تو والدین کے گھر سے ہوتا ہے مگر سسرال میں جا کر نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ پروین نے اپنی نظم "نک نیم" میں عورت اور گڑیا میں مماثلت پیدا کر کے دراصل اسی المیے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

تم مجھے گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو
کھیلنے والے سب ہاتھوں کو میں گڑیا ہی لگتی ہوں
جو پہنا دو مجھ پہ سب سجے گا
میرا کوئی رنگ نہیں
جس بچے کے ہاتھ تھما دو
میری کسی سے جنگ نہیں
سوچتی جاگتی آنکھیں میری
جب چاہے بینائی لے لو
کوک بھرو اور باتیں سن لو
یا میری گویائی لے لو
مانگ بھرو سیندور لگاؤ
پیار کرو آنکھوں میں بساؤ

اور پھر جب دل بھر جائے تو

دل سے اٹھا کے طاق پہ رکھ دو

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو

ٹھیک ہی کہتے ہو

اس نظم میں مرد کی اس ذہنیت کو سامنے لایا گیا ہے جس کے تحت وہ گڑیا کی طرح عورت کو بے جان چیز سمجھتا ہے۔ جب تک اس کا دل چاہتا ہے اس سے خود کو بہلاتا ہے اور دل بھر جانے کے بعد اس سے یکسر لاتعلق ہو جاتا ہے۔ اس پورے عمل میں مرد کی ہوشیاری اور عورت کی سادہ لوحی بنیادی رول ادا کرتی ہے۔ چوں کہ عورت اپنے پورے وجود کے ساتھ چاہت میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اندازہ نہیں لگا پاتی کہ مرد کی دکھاوے کی محبت کے پیچھے استحصال کا جذبہ بھی کارفرما ہوسکتا ہے۔ پروین نے اپنی نظمیہ شاعری کے ذریعے خواتین کے مسائل کو بخوبی پیش کیا ہے۔ نظموں میں بعض ایسے تلخ حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا اندازہ گہرے مشاہدے اور ذاتی تجربے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایسی ایک نظم ''مسفٹ'' ہے جس میں موقع پرست مرد کی طرف خفیف سے اشارے کئے گئے ہیں۔ نظم کا ایک اقتباس ملاحظ فرمایئے:

جب کہ صورت حال تو یہ ہے

میرا گھر

میرے عورت ہونے کی مجبوری کا

پورالطف اٹھاتا ہے

ہر صبح

میرے شانوں پر

ذمہ داری کا بوجھا لیکن

پہلے سے بھاری ہوتا ہے

پھر بھی میری پشت پہ

نااہلی کا کوب

روز بہ روز نمایاں ہوتا جاتا ہے!

یہ نظم اپنی کلیت میں عورت ہونے کی بے بسی کو پوری طرح سامنے لاتی ہے۔ مردوں کے بالمقابل ورکنگ لیڈی ہونے کے باعث عورتوں کو جو مسائل درپیش ہوتے ہیں ان کا بیان اس نظم میں بہت سلیقے سے کیا گیا ہے۔

پروین شاکر کی نظم "ناٹک" ایک گہرے طنز پر مشتمل ہے۔ معاشرے میں جہاں عورت مرد کی محکوم و مجبور ہے، اس کی حیثیت بندھوا غلام سے بدتر ہے اس کی آزادی، سرفرازی اور بہبودی کے تمام منصوبے محض ایک ڈھکوسلہ ہے۔ وہی منصوبہ بنانے والے مرد عورت کی زبوں حالی کی ذمہ دار ہیں وہ جب عورت کی Upliftment کی بات کرتے ہیں تو گویا اپنی نفی آپ کرتے ہیں اس لئے ایسے تمام ڈرامے اور کھوکھلے نعرے تھوڑی دیر کے لئے فضا میں ہنگامہ پیدا کرتے ہیں۔ نظم "ناٹک" ایسے

ہی محسوسات کا شعری پیکر ہے۔ جب خواتین کا عالمی سال منانے کے اعلانات ہوئے تو موقع پرست لوگوں نے عورتوں کی فلاح و بہبودی ان کی آزادی اور ترقی کے منصوبوں کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ انہوں نے عورتوں سے کہا کہ تم آج سے آزاد ہو، جہاں چاہو جاؤ، جیسے چاہو ویسے اپنی زندگی کو Enjoy کرو، کہ فطرت کی تمام رنگینیاں تمہارے لئے حاضر ہیں۔ چاند، سورج، ستارے، بادل، خوشبو، پتے، پھول اور جنگل قدرت نے تمہارے لئے بنائے ہیں عورتیں (جن کا ذکر نظم میں تتلی کے استعارے میں کیا گیا ہے) مردوں کی یہ تمام باتیں سن کر حیران ہوئیں اور صدیوں کی غلامی سے آزاد ہو کر جشن آزادی منانے لگیں مگر جشن ابھی ادھورا تھا کہ ان کے لئے واپسی کے احکامات صادر ہوئے کیوں کہ جو آزادی انہیں ملی تھی وہ حقیقتاً آزادی نہیں تھی محض ایک ناٹک تھا۔ خواتین کا عالمی سال ختم ہوا، آزادی سلب کر لی گئی اور وہی قید و بند، محکومی اور مجبوری عورت کا مقدر بنی۔

پروین شاکر نے عورتوں کے مسائل نظموں میں بھی پیش کئے ہیں اور غزل کے شعروں میں بھی لیکن نظموں میں سمندر کی بیٹی، خواب، صرف ایک لڑکی، بنفشے کا پھول، ناٹک، فلاورشور، بے نسب ورثے کا بوجھ، واٹرلو، جیسی اور کئی نظمیں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں:

سجے سجائے گھر کی تنہا چڑیا
تیری تارہ سی آنکھوں کی ویرانی میں

پچھم جا بسنے والے شہ زادوں کی ماں کا دکھ ہے

تجھ کو دیکھ کے اپنی ماں کو دیکھ رہی ہوں

سوچ رہی ہوں

ساری مائیں ایک مقدر کیوں لاتی ہیں؟

گودیں پھولوں والی

آنگن پھر بھی خالی!

(شعری اقتباس، نظم: دوست چڑیوں کے لئے کچھ حرف)

دور ساحل پہ بیٹھی ہوئی ایک ننھی سی بچّی

ہماری ہنسی اور موجوں کے آہنگ سے بے خبر

ریت سے ایک ننھا گھروندہ بنانے میں مصروف تھی

اور میں سوچتی تھی

خدایا! یہ ہم لڑکیاں

کچی عمروں سے ہی خواب کیوں دیکھنا چاہتی ہیں!

(خواب کی حکمرانی میں کتنا تسلسل رہے)

(شعری اقتباس نظم: خواب)

اپنے کالے ناخنوں سے

تتلی کے پر نوچ کے بولے

احمق لڑکی!

گھر واپس آجاؤ

ناٹک ختم ہوا!

(خواتین کا عالمی سال)

(نظم: ناٹک)

نظم ''نوشتہ'' غالباً اس وقت کی نظم ہے جب پروین کو طلاق ہو چکی تھی اور اس کا بچہ اس کی زیر نگرانی پرورش پا رہا تھا۔ اس نظم میں بچے کو خطاب کر کے یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا بچے کی شناخت اس کے باپ سے کرتی ہے لیکن جب کوئی بچہ مجبوریٔ حالات کی باعث ماں کے ساتھ بغیر باپ کے اپنی زندگی گزارتا ہے تو اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ باپ کے ہوتے، باپ کے نہ ہونے کا احساس نہ صرف اذیت ناک ہے بلکہ سماج میں ایک سوالیہ نشان کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے!

مرے بچّے!

ترے حصے میں بھی یہ تیر آئے گا

تجھے بھی اس پدر بنیاد دنیا میں، بالآخر

اپنے یوں مادر نشان ہونے کی، اک دن

بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی!

(ابتدائی حصہ نظم: نوشتہ)

پروین شاکر نے زندگی کے ہر مرحلے اور معاشرے کے ہر پہلو کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بھی زندگی کے تمام رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کی ذاتی شخصیت اور دلکش انداز بیان کے سبب ان کی رومانی شاعری پر زیادہ زور دیا گیا، لیکن اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو ایک باشعور، گہری بصیرت رکھنے والی عورت کا کردار ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔

پروین شاکر کے تمام شعری مجموعوں کو اٹھا کر دیکھیں تو ان میں ایک ارتقائی عمل صاف نظر آتا ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری رومان کی دنیا میں بسنے والی ایک نوخیز لڑکی کے نرم و نازک جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ لیکن جب وہ رومان کی دنیا سے نکل کر زندگی کی دوڑ میں شامل عورت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں تو ان کے تجربات اور مشاہدات ان کی فکر میں بھی ایک طرح کی گہرائی اور وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی نظم 'ورکنگ وومن' دیکھیے جس میں آج کی پاکستانی بلکہ برصغیر کی عورت کی ذہنی کیفیت کا اظہار کس قدر حقیقی پیرائے میں کیا گیا ہے:

کیسے غرور کی بات ہوئی ہے
میں اپنی ہریالی کو خود اپنے لہو سے سینچ رہی ہوں
میرے سارے پتوں کی شادابی
میری اپنی نیک کمائی ہے
میرے ایک شگوفے پر بھی

کسی ہوا اور کسی بارش کا بال برابر قرض نہیں ہے

میں جب چاہوں کھل سکتی ہوں

میرا سارا روپ میری اپنی دریافت ہے

میں اب ہر موسم سے سر اونچا کر کے مل سکتی ہوں

ایک تناور پیڑ ہوں اب میں

پروین شاکر نے صرف اعلیٰ اور متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ عورت ہی کے تجربات کو اپنی شاعری میں پیش نہیں کیا ہے۔ بلکہ نچلے طبقے کے پسماندہ انسانوں کی زندگی اور ان کی مسائل کو بھی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ یہ ان کی فنی بصیرت کی دلیل ہے کہ جس طبقے کی بات کی ہے اسی سے مناسبت رکھنے والا اسلوب بھی استعمال کیا ہے۔ ان کی نظم ''بشیرے کی گھر والی'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو!

ہے رے تری کیا اوقات!

دودھ پلانے والے جانوروں میں

اے سب سے کم اوقات

پرش کی پسلی سے تو تیرا جنم ہوا

اور ہمیشہ پروں میں تو پہنی گئی

جب ماں جایا پھلواری میں تتلی ہوتا

تیرے پھول سے ہاتھوں میں

تیرے قد سے بڑی جھاڑو ہوتی

سے کے ہاتھوں ہوتا رہے گا

کب تک یہ ایمان

ایک نوالہ روٹی

ایک کٹورے پانی کی خاطر

دیتی رہے گی کب تک تو بلیدان!

اس کے علاوہ پروین کی متعدد نظمیں ایسی ہیں جن کا تعلق عورت کے سماجی مسائل سے ہے جو اپنے پس منظر کے اعتبار سے مردوں کے تسلط پر مبنی سماج کے ردِ عمل میں کہی گئی ہیں۔ جہاں عورت کو صرف ذائقہ دار چیز اور جنسی آسودگی کا سامان سمجھا جاتا ہے۔

اس ضمن میں خاص طور پر ''پوسٹ ڈنر آئیٹم''، ''کتوں کا سپاس نامہ'' پیش کش نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ ان دونوں نظموں میں لہجے کی تلخی عروج پر ہے۔ نظم ''پوسٹ ڈنر آئیٹم'' کے مصرعے اس طرح ہیں:

آپ کے زلف کے ہم تو پہلے ہی گویا اسیروں میں تھے

آج تو آپ کے ہاتھ بھی چوم لینے کو جی چاہتا ہے

کہ آج آپ نے

اتنی انواع واقسام کی لذتیں میز پر جمع کر دیں

اورنظم اس وقت ایک عجیب نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے جب شاعرہ مکالمے کا جواب اس طرح دیتی ہے:

شکریہ

اس پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ

اب یہ فرمائیں، کیا پیش ہو

چائے، کافی کہ شاعر!

اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ پروین شاکر کا لب ولہجہ ایسے موقعوں پر طنز اور تعریض کے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام میں ایسی بہت سی نظمیں ہیں جس میں ہمارے معاشرے میں موجود زمانہ شناس لوگوں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ان کی درجنوں نظمیں انحراف اور بغاوت پر مبنی ہیں۔ اسی باعث ان کی نسائی رویے میں صرف اس بات کو اہمیت حاصل نہیں کہ وہ عورت یا بالخصوص نئی عمر کی لڑکیوں کے طرزِ احساس کی ترجمانی کرتی ہیں بلکہ پروین شاکر کو بحیثیت ایک جنس یا صنف، عورت کی مظلومیت اس کی پس ماندگی اور اس کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافی بھی بار بار کچو کے لگاتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی متعدد نظموں میں انحرافی اور مزاحمتی نقطۂ نظر کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کے یہاں خواتین کا طرزِ احساس صرف پدرانہ معاشرے میں استحصال کی نشان دہی نہیں کرتا بلکہ نسائی وجود کی بقا عزت نفس اور استحصال کے متعلق اپنے ردِ عمل کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔

○

معاصر شاعرات اور پروین شاکر

ترقی پسند تحریک کی ابتدا میں بھی ہمیں رشید جہاں کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔
یہ الگ سی بات ہے کہ ان کی شہرت افسانہ نگاری کے میدان میں رہا ہے۔ اور افسانہ
نگاری کے تعلق سے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر خواتین افسانہ نگاروں کا ایک قافلہ
ابھر کر سامنے آتا ہے۔ بعض خواتین افسانہ نگار تو ایسی ہیں کہ جن کا نام لئے بغیر اردو
افسانے کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی ایسے میں ظاہر ہے کہ شاعری کے میدان میں بھی
ترقی پسند تحریک کے زیر اثر خواتین قلم کاروں کا کوئی نہ کوئی قافلہ ضرور چل رہا ہوگا۔
لیکن تعجب کی بات ہے کہ ترقی پسند تحریک کی تاریخ لکھنے والوں نے انکا ذکر تک اپنی
تصنیفات میں نہیں کیا ہے۔

چنانچہ ترقی پسند تحریک کے پچاس سالہ سفر کا جو جائزہ ہمارے سامنے ہے۔
اس میں بھی شاعرات کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مساوات کے نعرے پر مبنی
اس تحریک کے علمبردار عورتوں کے ساتھ مساوات نہیں برت سکے۔ ان سے بہتر تو زمانہ
قدیم کے تذکرہ نگار تھے۔ جنہوں نے خاتون شاعروں کے تذکرے الگ سے لکھے۔

بقول سکینہ ساجد پنہاںؔ

''ایسے تمام رویئے کو صنفی تعصب کا نام دیا جا سکتا ہے جو اس صنف

کے ساتھ صدیوں رواں رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب انسانی کی بیس روشن صدیاں بھی عورتوں کے مقصد کی سیاہیاں نہیں مٹا سکیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے حوصلے پست نہیں اپنے اپنے معاشروں کی تمام شرمناک بدسلوکیوں کے باوجود خواتین اپنی تمام تر صلاحیتوں کو زندہ رکھنے اور بروئے کار لانے کی ہر ممکن کوشش میں کوشاں ہیں۔ نظر انداز کئے جانے کی اس جنگ میں خاموشی سر گرم جہاد ہیں اور جہاں زیادہ تر نام شہید ہو چکے ہیں۔ وہاں چند غازیوں کے نام بھی موجود ہیں۔'' (۱)

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تبدیلیوں نے جو لہر پیدا کی تو شاعرات کی ایک ناقابل قدر تعداد ابھر کر ہمارے سامنے آئی جنہوں نے اس تحریک کے بنیادی مزاج کی ترجمانی کو اپنی شاعری کا شعار بنایا۔ ان شاعرات میں سعیدہ بیگم اختر، رفیعہ بانو مضمرؔ، کے۔ ایف زہرہ، زیب تاجور زاھدہ خلیق الزماں، نجمہ تصدق، آمنہ برجیس، کنیز میمونہ اور برجیس نازش وغیرہ قابل ذکر ہیں:

وہ تھرا اٹھی ظلم و طاقت کی دنیا
وہ گھبرا اٹھی کبر و نخوت کی دنیا

(سیدہ اختر)

یہ کس کی خدائی ضربتِ پا سے ہوئی بیدار
سرمایہ و افلاس میں ہیں جنگ کے آثار

(آمنہ برجیس)

بدل دوں گی نظام زندگی کو سعی پیہم سے
زمانہ کانپ اٹھے گا مرے عزمِ مصمم سے

(رفعیہ بانومضمر)

مجھے یقین ہے کہ اور بھی خواتین نے شاعری کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہونگے۔

بہر حال اس دوران جن شاعرات کی تخلیقات ہمارے سامنے آئیں انہیں دو Catagery میں رکھا جاسکتا ہے۔ بقول بانو قدسیہ:

عورتوں میں دو قسم کی لکھنے والیاں پیدا ہوگئی ہیں ایک تو وہ ہیں جو زندگی سے وابستہ ہیں دوسری وہ ہیں جو صرف رومانس میں ڈوبی ہوئی ہیں۔(۲)

زندگی سے وابستہ شاعرات کے یہاں وہ تمام موضوعات مل جاتے ہیں جو ترقی پسند شاعری کا خاصہ قرار دیئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

ہزاروں کوششوں کے بعد بھی منظر وہی ہوگا
بدلتے جائیں گے قاتل مگر یکسر وہی ہوگا

(صغرا امام)

زندگی کیا ہے
دولت کے ترازو میں
لٹکا ہوا کانٹا ہے

(غوثیہ سلطانہ)

قہقہوں کی گود میں ہی سسکیاں رکھی گئیں
ہر خوشی میں درد کی پرچھائیں رکھی گئیں

(نفیس بانو شمع)

ان اشعار میں وہ تجربے بیان کئے گئے ہیں۔ جو استحصال کی صورتحال کو پیش کرتے ہیں۔ استحصال جو ترقی پسندی کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ لیکن عورت شاعروں کے یہاں استحصال کا یہ احساس اس وقت گہرائی اختیار کرلیتا ہے جب وہ عورتوں کا استحصال مردوں کے ہاتھوں ہوتا ہوا دیکھتی ہیں۔ اور یہی ان کا بنیادی موضوع بن جاتا ہے۔ زیادہ تر شاعرات نے استحصال کے اس منظر نامے کو پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

اپنے لئے ہمیں کبھی فرصت نہ مل سکی
اس کو گلہ کے ہم اسے حاصل نہیں رہے

(ثمینہ راجہ)

تو چھپاں کر لبوں پہ بجلیاں اب
کہ سب کچھ مل نہیں سکتا دُعا سے

(زرینہ زرین)

محبتیں تھی کبھی اپنے درمیاں کتنی
بچھا گئی ہے انا ہم میں دوریاں کتنی

(ناصرہ زبیری)

شاعرات کے یہاں جو دوسرا موضوع سر چڑھ کر اپنا جادو دیکھاتا ہے وہ ہے محبتوں، چاہتوں اور رفاقتوں کا احساس طلب، عورت کو جہاں محبت کی دیوی کہا جاتا ہے وہیں اس کے اندر محبت کی چاہت بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے اور جب یہ چاہت اسے پوری ہوتی نظر نہیں آتی تو ایک طرح کی محرومیوں کا احساس جاگنے لگتا ہے۔ اور یہی دونوں احساسات سب سے زیادہ عورتوں کی شاعری میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

اور تو اس کے سوا ہمیں کیا پوچھتا ہے
تجھ سے مل کر کبھی احوال تیرا پوچھنا ہے

(ریحانہ روحی)

اشک میرے تھے اور تمہاری رات
مل کے دونوں نے یوں سنواری رات

(رضیہ شمع)

میں سمندر، سمندر کی طرح پیاسی ہوں
کیا کروں گی تمہیں سیراب میں شرمندہ ہوں

(فوقیہ مشتاق)

ان کو پل پل میں جی لیتی
اوشا پاس کبھی وہ آتے

(اوشا بھدوریہ)

اس جیسے اشعار خاتون شاعرات کے یہاں بہت کثرت سے ملتے ہیں۔ دراصل ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ایک حلقہ ایسا بھی تھا جو حلقہ ارباب ذوق کے نام سے پکارا گیا۔ اس حلقے سے تعلق رکھنے والے شعراء نے سماجی حقیقت کی جگہ نفسیاتی حقیقت نگاری کو اہمیت دی۔ اور انسانی نفسیات کی گرہ کشائی کا کام اپنی شاعری سے لیا۔ خاص طور جنسی موضوعات کو اس حلقے سے وابستہ شاعروں نے اہمیت دی۔ ان میں میراجی، ن۔م۔راشد کا نام قابل ذکر ہے۔ شاعرات کو بھی اس حلقے کے موضوعات نے متاثر کیا۔ اور ان کی شاعری میں ایک عورت کی نفسیات کی مختلف جہتیں ابھر کر سامنے آنے لگیں۔ ان شاعرات میں زاہدہ زیدی۔ ساجدہ زیدی وغیرہ کا نام اہم ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کی شاعری جہاں ترقی پسند تحریک کے ردِعمل کے طور پر ابھر کر سامنے آئی وہیں اس کی توسیع جدیدیت کی شکل میں ابھری۔

میں کیا ہو؟

کون ہوں؟

کہاں سے آئی ہوں؟

کس سمت جاؤ نگی؟

میری ہستی اور میری نیستی میں کیا فرق ہے؟

(ساجدہ زیدی)

یہ وہ سوالات ہے جن کے جواب کی تلاش میں سرگرداں زندگی جدیدیت کا

موضوع ہے۔انسان کا انسان پر سے ختم ہوتا اعتماد بیسویں صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔جس نے ہر شخص کو اس کی ذات میں تنہا کر دیا ہے۔جدید شاعرات نے اقدار کی اس شکست وریخت کو اپنے ذات کے وسیلے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ان کے حساس دل نے ان تجربات سے لفظی پیکر تراشی محض شاعری برائے شاعری نہیں بلکہ زندگی کی پیچ در پیچ گتھیوں کو سلجھانے کی خواہش کا نتیجہ ہے۔یہ الگ سی بات ہے کہ گتھیاں جتنی سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے دھاگے اور الجھتے جاتے ہیں۔جدید شاعرات نے انہیں دھاگوں کو شاعری کی شکل دے دی ہے۔ملاحظہ ہوں چند اشعار:

میری پہچان کیا ہے؟
کون ہوں؟ کیا ہوں؟
گذرتے وقت کی شاید ہوا ہوں
فغاں کی دھیمی دھیمی سسکیاں بھی جس میں شامل ہیں
اور کچھ سرشارئی بادبہاری
خس وخاشاک کی سرسراہٹ بھی

(رعنا زیدی)

اک پیاؤ یا کوئی چوپال یا پھر اشتہاری تختیاں
بچوں کا اک اسکول
اک ٹوٹی ہوئی سی شاخ یا اکھڑا ہوا پتھر

ہمیں کچھ بھی نہیں ہے یاد کہ کن شاہراہوں سے

کہ کن پر پیچ گلیوں سے

گزر کر ہم یہاں تک آ گئے ہیں۔

(شہناز نبی)

جدیدیت کی یہ تحریک شاعری میں نئے تجربات کی تحریک تھی۔ جہاں لفظیات کے استعمال اور شعری ہیئتوں کی ترتیب و ترکیب میں ایک جدت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جدت کی فکر میں شعراء نے کچھ ایسی ہوڑ لگائی کہ لفظ و معنی ایک دوسرے میں ضم ہو کر گم ہو گئے۔ اور مفاہیم مبہم ہو گئے۔

جدیدیت اپنے یکسانیت کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اور پھر روایت و جدت اور ترقی پسندی کی آمیزش سے شاعری کا ایک نیا اسلوب ابھر کر سامنے آیا۔ یہ نیا اسلوب نئی معنویت سے لبریز تھا۔ یہاں زندگی کا صرف ظاہری عکس دکھائی نہیں دیتا تھا بلکہ نفسیاتی حقیقت نگاری اور دیگر عالمی شعری رجحانات کی ترجمانی اس کا مرکز و محور تھی۔ سماج کے مروجہ اصولوں سے انحراف اس کا بنیادی مزاج تھا۔ اس مزاج کی نمائندگی کرنے والی شاعرات میں فہمیدہ ریاض، زہرا نگاہ، ادا جعفری، کشور ناہید، شائستہ یوسف، سارہ شگفتہ وغیرہ کا نام نمایاں ترین اہمیت کا حامل ہے۔ یہ وہ شاعرات ہیں جنہوں نے عورت اور مرد کے ازلی رشتے کے تعلق سے زندگی کے ان تجربات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ جنہیں شاید ایک عورت سے زیادہ کوئی دوسرا محسوس نہیں کر سکتا۔ ان

شاعرات کے یہاں ایک پوری عورت کا اجتماعی شعور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ عورت کے نفسیاتی، جذباتی اور مابعد الطبیاتی Metaphysical وجود کو تسلیم کیئے جانے کا اصرار ملتا ہے۔ اس دور سے پہلے جو شاعرات ملتی ہیں ان کے یہاں بس غزل کی روایت کی پاسداری ملتی ہے۔ بہت ہوا تو رومانی خیالات کی ترجمانی یا پھر عورتوں کی نیم جاہ حسرتوں ٹوٹتے بکھرتے خوابوں اور گمشدہ ارمانوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بنیادی طور پر زمانہ قدیم کی شاعرات کے یہاں عشق اور معاملات عشق کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی تنقید کے تعلق سے جو بھی باتیں کی گئی ہیں۔ ان میں شاعرات کے حوالے نہ کے برابر ملتے ہیں۔ یہ تو اس عہد کی شاعرات ہیں۔ جنہوں نے نسائی تجربوں کو اپنے رگوں پے میں محسوس کیا اور اس کی مختلف حیاتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو کھلے لفظوں میں بیان کیا اور ان کو استعاراتی روپ عطا کیا۔ الفاظ وتراکیب کے استعمال میں بھی ان کے یہاں قدیم شاعرات اور مرد شاعروں سے الگ ہٹ کر ایک خاص رکھ رکھاؤ ملتا ہے ملاحظہ ہوں چند اشعار:

نہیں نہیں ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں
تجھے بھی بھول گئے ہم تیری خوشی کے لئے

(زھرا نگاہ)

سراب ہوں کہ بدن کی یہی شہادت ہے
ہر ایک عضو میں بہتا ہے ریت کا دریا

(فہمیدہ ریاض)

ستم شناس ہو لیکن زبان بریدہ ہوں
میں اپنے پیاس کی تصویر بن کے زندہ ہوں

(فہمیدہ ریاض)

دلوں نگاہ کے ہر امتحان سے گذرے ہیں
خاموش رہ کے بھی حسن و بیاں سے گذرے ہیں

(ثریا فخری)

آدھی ان کی سُن چکی ہوں
آدھی بات پہ اڑی ہوئی ہوں

(شبنم شکیل)

ترقی پسند ہو یا جدیدیت بغاوت دونوں کا بنیادی لہجہ ہے یہ الگ سی بات ہے کہ ترقی پسندوں کی بغاوت کی نوعیت سیاسی و سماجی ہے اور جدیدیت کے علمبرداروں کے یہاں بغاوت اپنی ذات سے بغاوت کی صورت میں اظہار پاتا ہے۔ خاتون شاعروں کے یہاں یہ بغاوت اس سماجی رویئے کے خلاف ہے جو عورتوں کی حالتِ زار کے لئے ذمہ دار ہے۔ اس کے لئے ایک طرف تو سماجی و مذہبی رویئے ذمہ دار تھے دوسری طرف خود اس عورت کی ذات تھی جس پر اندھیرے کی ایک سیاہ دبیز چادر تنی ہوتی تھی۔ اور وہ ایک غیر یقینی اور بے اعتبار زندگی جی رہی تھی۔ ان دونوں صورتحال کی عکاسی ہمیں شاعرات کے یہاں مل جاتی ہے۔ پہلی صورت ترقی پسندی

سے متاثر شاعرات کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ اور دوسری صورت کا اظہار جدید شاعرات کے یہاں ملتا ہے۔

○

حواشی

۱ عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب، ماہنامہ 'شاعر'، خصوصی شمارہ، جلد ۷۰، ص ۶

۲ ایضاً، ص ۸

شفیق فاطمہ شعریٰ

شفیق فاطمہ شعریٰ کے مورث اعلیٰ افغان النسل تھے۔ ان کے پردادا سید قاسم شاہ تھے۔ سید قاسم شاہ کے ایک صاحبزادے کا نام سید امداد علی تھا جو شفیق فاطمہ کے دادا تھے۔ سید امداد علی کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سید امداد علی کے تیسرے صاحبزادے سید شمشاد علی، شفیق فاطمہ شعریٰ کے والد تھے۔ شفیق فاطمہ کے والد شمشاد علی مدھیہ پردیش میں محکمۂ معتمد تعلیمات میں ہیڈ کلرک تھے۔ ان کی چھ بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کی تاریخ ولادت ۱۷ مئی ۱۹۳۰ء ہے۔ آپ ناگپور میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں SSC کا امتحان پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ ۱۹۵۴ء میں کی۔ شفیق فاطمہ نے اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم میں بھی سند حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء میں انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس بی اے پاس کیا۔ بی ایڈ کی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد ان کا گورنمنٹ گرلس ہائی اسکول اورنگ آباد میں بحیثیت ٹیچر تقرر ہوگیا۔ جہاں وہ آٹھ سال تک برسر کار رہیں۔ انھیں اسٹیٹ آرگانائزنگ فار اسکاوٹ اینڈ گائڈس میں کام کرنے کا موقع ملا۔ شفیق فاطمہ شعریٰ نے ۱۹۶۲ء میں پرائیویٹ طور پر ناگپور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کا امتحان بدرجہ دوم پاس کیا۔ اورنگ آباد میں مولانا آزاد کالج ہندوستان کی آزادی کے بعد قائم ہوا۔ شفیق فاطمہ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک بحیثیت لکچرر اردو اس کالج سے

وابستہ رہیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کی شادی ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر محمد ولی اللہ سے حیدرآباد میں ہوئی جو ویٹنری ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے امریکہ سے .M.S کیا تھا۔ شادی کے بعد شفیق فاطمہ اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہوگئیں۔ یہاں انھیں ۱۹۷۱ء میں ممتاز کالج میں بحیثیت لکچرر تقرری ہوگئی۔ (شخصی انٹرویو)

ان کی پہلی نظم ''فصیل اورنگ آباد'' ماہنامہ 'شاہراہ' دہلی میں جون ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کی اشاعت کے بعد وہ ادبی حلقوں میں متعارف ہوئیں۔ ان کی شعری صلاحیت کو ناقدین سخن نے بھی سراہا۔ ماہنامہ 'شاہراہ' دہلی میں اپنی نظم کی اشاعت کے بعد شعریٰ نے اپنا کلام ہفت روزہ 'آئینہ' دہلی، ماہنامہ 'صبا' حیدرآباد اور 'سوغات' سہ ماہی، بنگلور میں شائع کیا۔ کتابی صورت میں ان کے کلام کو شائع کرنے میں خاصی دیر ہوگئی۔

شفیق فاطمہ کا مجموعہ کلام ''آفاق نو'' ۱۹۸۷ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ کلام ''گلہ صفورہ'' ۱۹۹۰ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ انھیں جنوبی ہند کے ایک علمی ادارے بنگلور نے ان کے مجموعہ کلام ''آفاق نو'' پر انعام سے نوازا۔ یہ انعام انھیں ۱۹۸۸ء میں عطا کیا گیا تھا۔ ان کے کلام کو چھ ادبی و علمی جرائد نے اپنی اپنی اشاعتوں میں شامل کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) In Their Own Voice Ariene, R. K. Zaidi Publisher, Penguin

ادارے نے شفیق فاطمہ شعریٰ کی دو نظموں کو اپنی اشاعتی پروگرام میں شامل کیا۔

(۲) ''حیدرآباد کے شاعر'' مرتبہ سلیمان ادیب نے شعریٰ کی تین نظموں کو منتخب

کر کے شائع کیا ہے۔ یہ نظمیں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۵ء تک ''صبا'' میں شائع ہوئیں۔

(۳) مرہٹھواڑہ یونیورسٹی نے ''نئے کلاسکس'' عنوان کے تحت شاعری کا انتخاب شائع کیا ہے۔ اس میں بھی شفیق فاطمہ کی تین نظموں کا ڈائجسٹ کیا گیا ہے۔

(۴) ''شیرازہ'' مرتبہ گوپال نے بھی شفیق فاطمہ شعریٰ کی تین نظموں کو منتخب کر کے شائع کیا ہے۔

(۵) ''اردو ادب، آزادی کے بعد'' خلیل الرحمن اعظمی کا مرتبہ مجموعہ کلام ہے جس میں شفیق فاطمہ شعریٰ کی تین نظمیں شامل ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک شائع ہوتی رہی۔

(۶) بنگلور سے ''سوغات'' سہ ماہی شائع ہوتا تھا جس کے ایڈیٹر محمود ایاز تھے۔ انھوں نے 'سوغات' کا جدید نظم نمبر شائع کیا تھا جس میں شفیق فاطمہ شعریٰ کی تین نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ ان میں ان کی نظمیں ۱۹۸۵ء سے ۱۹۶۱ء تک شائع ہوتی رہی۔

(۷) حیدرآباد سے پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر شہریار کی ادارت میں ''شعر و حکمت'' شائع ہوتا تھا۔ اس کی ایک جلد کتاب ۲، دور سوم میں شفیق فاطمہ شعریٰ کی نظموں کا نہ صرف انتخاب شامل ہے، ان پر ایک تنقیدی مضمون بھی شائع کیا گیا ہے۔ مضمون قاضی جمال حسین نے لکھا ہے۔ ابھی ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔

شفیق فاطمہ شعریٰ ان معنوں میں خوش نصیب ہیں کہ ابتدائی دور ہی سے ان کو ایسے نقادوں سے سابقہ رہا جنھوں نے ان کی خدمات کی دل کھول کر داد دی مثلاً ڈاکٹر وحید اختر، سلیمان اریب، مجید امجد، خلیل الرحمن اعظمی، محمود ہاشمی، مضطر مجاز اور حمید

نسیم نے شفیق فاطمہ شعریٰ کی نظموں کا تجزیہ کیا ہے۔

کسی بھی انسان کی شخصیت کی تعمیر میں توارث (Heredit) اور ماحول (Environment) بنیادی کام کرتے ہیں۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کو اچھا توارث ملا تھا۔ ان کے آبا و اجداد نہ صرف اچھے عالم دین تھے بلکہ ان کے خاندان کے کئی افراد نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ ان کے والد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا اور ناگپور یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا تھا اور C.P. میں محکمہ تعلیمات سے وابستہ تھے۔ خود ان کی والدہ باوجود ڈگری یافتہ نہ ہونے کے علمی و ادبی ذوق کی حامل تھیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کے ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے جو چیز محسوس کی وہ ان کے خاندان کی ''تحفظ'' کی کوشش تھی۔ جنگ آزادی اپنی جگہ لاکھ درست سہی لیکن سارے ملک میں انتشاری جبلتیں انسان کے لیے اجیرن بن گئیں تھیں۔ ہندو اپنا تحفظ کے علاوہ زیادہ سے زیادہ مراعات اور آزادی سے ملنے والی نعمتوں کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مسلمان چونکہ ایک حکمراں کی حیثیت سے چھ سات صدیوں تک ایک مقام اور مرتبہ کے حامل رہے تھے۔ اچانک ہندوؤں کی عظیم اکثریت کے سامنے خطرات محسوس کر رہے تھے۔ یہاں بھی ''تحفظ ذات'' کی جبلت اپنا کام کر رہی تھی۔ اس دور کی سماجی نفسیات تھی۔ اس دور کے بڑے سے بڑے قائد اور نیتا کے سامنے اپنا مستقبل تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے دیس کو محض تحفظ کی خاطر تقسیم کرنا پڑا۔ آزادی ضرور ملی لیکن آزادی کا یہ اجالا داغ داغ تھا۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کی ابتدائی زندگی اسی داغ داغ اجالے میں آگے بڑھتی رہی۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۷۴ء کا دور بڑا معنی خیز ہے۔ ۱۹۳۰ء میں وہ پیدا ہوئیں۔ ۱۹۳۱ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں لندن میں ہندوستان کے مسائل کو حل کرنے کے لیے گول میز کانفرنس ہوئی۔

۱۹۵۰ء میں جب ہندوستان نے جمہوریہ (Republic) اعزاز اور درجہ حاصل کیا، شفیق فاطمہ شعریٰ ۲۰، ۲۱ سالہ خاتون تھیں۔ اس دوران انھوں نے اور ان کے خاندان نے فرقہ پرستی کے شیطانی ناچ کے کئی مناظر دیکھے تھے۔ خواجہ احمد فاروقی نے ''میر تقی میر: حیات اور خدمات'' میں میر کے دور کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ''میر قلزم خوں کے شناور تھے'' یہاں بھی شفیق فاطمہ شعریٰ کا ماحول قلزم خون کی طرح تھا لیکن انھوں نے اس پر آشوب دور سے ''غم'' کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ یہی شفیق فاطمہ شعریٰ کی شخصیت کا روشن پہلو ہے۔ اگر ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء کا اردو ادب کا تفصیل سے مطالعہ کیا جائے تو جو مجموعی تاثر ابھرتا ہے وہ یہ کہ اردو بولنے والوں نے اور اس زبان کے شاعروں اور ادیبوں نے ہمت اور مردانگی کا دامن نہیں چھوڑا۔ فرار کی راہ بھی اختیار نہیں کی۔ پوری ہوش مندی، جرأت اور دیانت داری سے ماحول کا مقابلہ کیا خاص طور پر اس دور کے انتشاری رجحان کو قابو میں لانے کے لیے سعی کی جو سعیِ مشکور ثابت ہوئی۔ صرف پانچ برسوں کا مطالعہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ اردو کے شاعروں اور افسانہ نگاروں نے فسادات، تنگ نظری، قتل ناحق، لیڈروں کی کارستانیوں، چور بازاری، استحصال، عصمت فروشی وغیرہ جیسے موضوعات پر اتنا لکھا کہ سارا عہد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس دور کے ادب کی سب سے اہم خصوصیت رجائیہ انداز فکر ہے۔ یہ شاعر اور ادیب مایوسی کا کبھی شکار نہیں ہوئے۔ زہرناکی اور غیر ضروری طنز سے بھی اجتناب کیا اور اردو زبان اور اس کے بولنے والوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کی معاشی حالت کو برباد کر دیا گیا تھا۔ سیاسی سطح پر ان کی ہر طرف رسوائی کا سامان تھا۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ اردو تنقید نے بھی ان تخلیقات کو خوب سہارا دیا۔ انشاء پرداز اور مضمون نگاروں نے صحافت کی مدد سے بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی۔

مختصر یہ کہ یہ مختصر پرآشوب دور کسی ایک شاعر یا ادیب کی شخصیت کو سمجھنے کا ذریعہ نہیں بلکہ مجموعی طور پر تمام اردو بولنے والوں کی اجتماعی زندگی کا رخ روشن ہے۔ خاص طور پر اردو ادب کی تاریخ میں ایسے دور بار بار آئے ہیں۔ کبھی بیجاپور کی تباہی کے بعد تو کبھی گولکنڈہ کے بعد کبھی ابدالی کے حملہ کی وجہ سے تو کبھی شجاع الدولہ اور مرہٹہ گردی کی وجہ سے، سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کی شہادتوں سے بھی اردو بولنے والوں نے ہمت اور مردانگی کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان کی قومی شخصیت ہمیشہ بے داغ رہی۔ یہاں تک کہ شفیق فاطمہ شعریٰ کے عہد میں ہندستانی زندگی میں فرقہ پرستی کا جنون اور ریاست حیدرآباد پر فوجی کارروائی اور مملکت آصفیہ کے خاتمہ کے سانحہ نے بھی کسی کو دل برداشتہ نہیں کیا۔ یہاں شفیق فاطمہ شعریٰ کی حیات اور ان کی شخصیت کا احاطہ کرنے کے لیے حکومت ہند کی مملکت آصفیہ کے خلاف فوجی کارروائی کا مطالعہ نہایت معنی خیز ہوگا کیونکہ صرف ایک سال کے دوران اردو زبان و ادب کے گہوارے کو ہمیشہ کے لیے سیاسی طور پر ختم کردیا گیا تھا۔ اردو بولنے والوں نے اس حادثہ کا جس سکون رجائیت سے بھرپور رویہ کی بنیادوں پر مقابلہ کیا وہ دنیا کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔ صرف چند ہفتوں میں نئے حالات سے مفاہمت کا شعور اور نئے مطالبات زندگی سے مفاہمت کا سلیقہ ہمارے ادیبوں نے پیدا کیا۔

ان کی ایک نظم ہے ''خوابوں کی انجمن'' جس میں ان کی شخصیت وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ انھوں نے ''خوابوں کی جو انجمن'' سجائی ان کے افکار کی ترجمان ہے۔ بحیثیت ایک شاعرہ وہ وضاحت بیاں کا بوجھ اٹھا نہیں سکتیں۔ کئی اشعار میں وہ دل کو لبھانے والے اشعار سے اپنے واردات قلبی کو بیان کرتی ہیں یہ بھی ان کی شخصیت کا ایک دل نواز پہلو ہے۔ ایسے اشعار جن سے نئے ہندوستان کی تعمیر کا جو عزم اور حوصلہ واضح ہوتا ہے وہ اس نظم کا مقصد تخلیق ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خود شاعرہ کی

شخصیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً ان اشعار پر غور کرنا ضروری ہے:

ہو نمود ہستی کی شکل کوئی بھی لیکن
تاب وتب ہی عنوان ہے زیست کی کہانی کا (۱)

ہندوستان کی سیاسی تقسیم کے پس منظر میں شفیق فاطمہ شعریٰ کا یہ کہنا:

ہو نمود ہستی کی شکل کوئی بھی لیکن

گہری معنویت رکھتا ہے۔ اس شعر کے مصرعہ ثانی میں ایک عالم گیر سچائی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ''تاب وتب ہی عنواں ہے زیست کی کہانی کا۔''

بظاہر یہ مصرعہ رجائیہ لہجہ سے ہٹا ہوا ہے لیکن حقیقت سے انکار نہیں کہ زیست کی کہانی میں آلام ومصائب ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اسی لیے دوسرے شعر میں صاف صاف کہتی ہیں:

امتحاں نئے ہوں اور رنج وغم انوکھے ہوں
ایک ایک رخ دیکھیں جو آسمانی کا

اسی فلسفہ حیات کی ترجمانی کے لیے ایک اور شعر قابل مطالعہ ہے:

مثل موج مٹ مٹ کر زندگی ابھر آئے
ساتھ دے سکیں جوے وقت کی روانی کا

ہندوستان کی آزادی کے بعد کے پرآشوب حالات کو ذہن میں رکھ کر ۱۹۵۵ء میں لکھی گئی یہ نظم اردو شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کے عزائم کی شاہد ہے صرف چند برسوں میں مثل موج مٹ مٹ کر پھر آگے بڑھنے کی تمنا شفیق فاطمہ شعریٰ کی شخصیت کی ترجمان ہے۔

یہاں اس نظم ''خوابوں کی انجمن'' کا ایک اور بند درج کیا جاتا ہے جس میں شفیق فاطمہ شعریٰ کا رجائیت سے بھرپور رویہ ان کی شخصیت کا ترجمان ہے۔ نئے

ہندوستان کی تعمیر کے لیے آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک سیلاب اُمڈ آتا نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تاریخ کا شعور اور اپنے ماضی سے وابستہ رہنے کا عزم ان اشعار کے محاسن ہیں۔ ہمارے نزدیک ایک شاعرہ کی شخصیت کے دل نواز نمونے ہیں۔

چھ بہنوں اور دو بھائیوں، ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں پر مشتمل شفیق فاطمہ شعریٰ کا خاندان فرقہ پرستی کا شکار ہوکر جب اورنگ آباد کی سرزمین پر سر چھپانے کے لیے آیا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی کا یہ شعور اور ذمہ داری کا احساس کہ:

داغ ہم نہ بن جائیں خانداں کے دامن پر

نہایت پاکیزہ شخصیت کی غمازی کرتا ہے

نظم ''خوابوں کی انجمن'' شفیق فاطمہ شعریٰ کی ابتدائی شاعری کی یادگار ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے شفیق فاطمہ شعریٰ کی شخصیت کا اٹھان کا اندازہ ہوتا ہے۔ شخصیت کا ادراک فن وفکر کے ساتھ ساتھ عمل سے بھی کیا جانا ضروری ہے۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری کے ابتدائی دور میں جو نہ صرف ان کے لیے پوری قوم اور ملک کے لیے ایک پرآشوب دور تھا جس انداز سے زندگی کے مطالبات کو قبول کیا وہ ان کی شخصیت کا نہایت جاندار پہلو ہے۔ ماحول اور مسائل سب انسانوں کے لیے یکساں ہوتے ہیں لیکن مختلف لوگ مختلف انداز سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کوئی فرار کی راہ اختیار کرتا ہے کوئی بغاوت کی اکثر لوگ گمنامی اور خموشی کا اپنا مقدر سمجھتے ہیں۔ شفیق فاطمہ شعریٰ نے اپنے جذبات اور احساسات اور ماحول کی ترجمانی کے لیے شاعری کو وسیلہ اظہار بنایا۔ لکھتی ہیں:

شاعری بہانہ ہے بات صرف اتنی ہے

خونِ دل لٹاتا ہے بہر حالم آرائی

اکثر اشخاص اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی شخصیت کی تعمیر کرتے

ہیں۔ چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ان کے قدموں کے نقوش کا نشان منزل سمجھیں۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کی زندگی میں دونوں طرح کے انداز فکر کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کی امین ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے معاصرین کی ہم نوا بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد اردو زبان کے شاعروں اور افسانہ نگاروں نے اس دور کے حالات کی جتنی خوبصورتی سے ترجمانی کی، کسی دوسری صنف ادب میں نہیں ملتی۔ آزادی سے قبل تحریک آزادی کی جھلکیاں اقبال، چکبست اور جوش وجگر کے پاس وضاحت سے مل جاتی ہیں۔ پریم چند کے ناول اور افسانے اس دور کے خوبصورت ترجمانی کرتے ہیں۔ ان بزرگوں نے (جوش اور جگر کو چھوڑ کر) آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے وہی دم خم اور عصری حسیت بعد کے فنکاروں کو ورثہ میں ملی۔

''آفاق نوا'' شفیق فاطمہ شعریٰ کا پہلا مجموعہ کلام ہے جس میں بشمول پیش لفظ اٹھارہ نظمیں ہیں۔

☆ پیش لفظ
☆ شرنوا
☆ شجر تمثال
☆ کھیل رتوں کا
☆ لب کشا
☆ ارض موعود
☆ ان ماں
☆ بازگشت

☆ شب نامہ

☆ امیر جامعہ ذاکر صاحب کی یاد میں

☆ شفیع الاصم

☆ افتاد گاہیں غدم کی

☆ بہتا پانی

☆ فجر کا الاؤ

☆ نرل میٹھے پانی کی تلاش

☆ جادہ رسائی

☆ فدائیت ثمود خواب

محمود ہاشمی نے ''آفاق نوا'' کی اشاعت پر ایک جائزہ شائع کیا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں:

''آفاق نوا'' اس فنکار کی نظموں کا مجموعہ ہے جس سے اس صدی کی پانچویں دہائی میں جدید شاعری اور جدید نظم سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ یہ زمانہ ادبی اعتبار سے غیر معمولی شکست و ریخت اور تبدیلیوں کا زمانہ ہے۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کی نظمیں بھی ایک نئے انداز میانہ طلبی کی حامل تھیں۔ ''سوغات''، ''صبا'' اور بعد میں ''شب خون'' جیسے مستند ادبی رسائل میں شفیق فاطمہ شعریٰ کی نظمیں شائع ہوتی رہی۔ اردو میں اور خصوصاً جدید نظم میں کسی نسوانی آواز کا عدم وجود بے حد کھلتا تھا۔ شفیق فاطمہ شعریٰ نے لکھنا شروع کیا اور اپنی نظموں کو ایسے ادبی رسائل تک محدود رکھا جو اپنے ادبی مطالبات سے آگاہ تھے۔''

''آفاق نوا'' میں شامل ایک نظم ''کھیل رتوں کا'' شفیق فاطمہ شعریٰ کے فلسفہ حیات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ رت یا موسم وقت کی طرف قاری کے ذہن کو مبذول

کرتے ہیں۔ رت یا موسم متعین وقفہ کی نشاندہی کرتے ہیں، جو اپنے وقت مقررہ پر آتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وقت کا دھارا بہتا رہتا ہے۔ کچھ ایسا ہی منظر حیات انسانی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں وقت اور زندگی کے درمیان قائم رشتوں کو شاعرانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ نظم میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں شاعرہ نے ماحول سے متاثر ہو کر اپنے افکار کی ترجمانی کی ہے۔ اورنگ آباد اور اس کے قریب اجنتا اور ایلورہ کے تاریخی غار ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں کہ:

دھندلے دھندلے غاروں میں
وہ گھومتے پھرتے رستے
آواز کے لہرے کو پھر
باہر لے آئے
تپتے سورج کے نیچے

شفیق فاطمہ شعریٰ نے اپنی اس نظم کا آغاز اس طرح کیا ہے:

اک رُت آئے اک جائے
ہم رت رت چونکیں
کروٹ بدلیں سو جائیں

نظم کا آغاز نظم میں پیش کردہ مرکزی فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ اورنگ آباد ہو یا اجنتا یا ایلورہ ہر ایک رت ایک متعینہ وقت سے وابستہ ہے۔ وہ رت یا موسم یا وقت گزر چکا اس کے جگہ نئے نئے موسم آئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

''گلۂ صفورا'' شفیق فاطمہ شعریٰ کا دوسرا مجموعہ کلام مکتبہ جامعہ، نئی دہلی کے زیر اہتمام نومبر ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس شعری مجموعہ میں حسب ذیل عنوانات کے تحت شفیق فاطمہ شعریٰ کی ۳۴ نظمیں شامل ہیں۔

انتساب جو منظوم ہے، کے بعد

(۱) ارض نغمہ (۲) رسالت
(۳) جب سحر آئی (۴) یادنگر
(۵) فضل اورنگ آبادی (۶) ایلورہ
(۷) خوابوں کی انجمن (۸) سیتا
(۹) زیر چرخ کہن (۱۰) درماں
(۱۱) خلد آباد کی سرزمیں (۱۲) سمتیں
(۱۳) مسافر پرندے (۱۴) خلائے بے کراں
(۱۵) زوال عہد تمنا (۱۶) فضل نیک قال
(۱۷) اسیر (۱۸) دھند کے برحق
(۱۹) مجذوب (۲۰) افق درافق
(۲۱) حکایت زوالنون (۲۲) گلۂ صفورا
(۲۳) عکس نغمہ، ترجمہ اسپیم کے غنائی شاعر Ramonji Menes کی نظمیں،
(۲۴) تار چمکا (۲۵) وہ رادھا رانی امر
(۱۶) یاروطن (۱۷) فطانت آرزردہ قمری
(۱۹) پریتی (۳۰) چلنا چلنا مدام چلنا
(۳۱) نذر نغمہ (۳۲) تار رگ جاں
(۳۳) دولم ما (۳۴) ورائے نور
(۳۵) سرمایہ بہار مندرجہ بالا
(۳۶) نظموں کے بعد صرف ایک غزل اور سات قطعات بھی ہیں۔

''آفاق نوا'' میں نظم ''کھیل رتوں کا'' جیسی ایک اور نظم ہے جس کا عنوان

''رت مالا'' ہے۔

لفظ ''مالا'' کو سن کر تسلسل کا تصور ابھرتا ہے۔ رت کا تسلسل یہاں بھی ہے۔ ''وقت'' کا دھارا بہتا نظر آتا ہے۔ اس نظم کا اگر گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا جائے تو ہمارے سماجی اور معاشرتی قیود اور پابندیاں یکے بعد دیگرے ہماری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ خود انسان ایک پربت کی طرح سرفراز کھڑا ہوا ہے۔ اس کے وجود سے ہو کر گزرنے والے کئی رت آتے جاتے ہیں۔ اس خیال کو شاعرہ ہی کے زبان سے سنا جائے تو بات انگیز ہوگی۔ فرماتی ہیں:

نیلے بھورے پربت تجھ پر
برکھا موسم برسی
تجھ کو بہا نہیں پائی
آندھی ٹکرائی پر اڑا نہیں پائی
دھوپیں پگھلانے کو بڑھیں
تب بدلی چھتر بنی
تب شیتل شام آئی
نیلے بھورے پربت

انسان کی استقامت اور اس کا عزم محکم شاعرہ کے نزدیک ''پربت'' کے مانند ہے۔ پربت کی مناسبت سے نیلا یا بھورا رنگ، برکھا، برسنا اور بہالے جانا آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شفیق فاطمہ شعریٰ کے پاس مطالعہ کے ساتھ ساتھ زندگی کے ان گنت واقعات کا پھیلاؤ اور وسعت نے ان کو کسی مخصوص آئیڈیالوجی میں اسیر ہونے سے روک رکھا ہے۔ وہ کسی نوع کی حد بندی کو قبول نہیں کرتی۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری کے محاسن میں جو چیز قاری کو شدت سے متاثر

کرتی ہیں وہ یہ کہ شفیق فاطمہ شعریٰ پہلے اپنے ماحول سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ اپنے اس تجربہ کو یقینا حال کا تجربہ مانتی ہے۔ ماضی بعید کے تجربوں سے ہم کنار کر دیتی ہیں۔ ان کے تجربات ان کے شاندار ماضی میں بکھیرا ہوا ہے۔ ادبی، علمی، ثقافتی اور روحانی ورنہ آپس میں تحلیل ہوکر ایک ہوجاتا ہے۔ اس طرح وہ حال کا تجربہ کو ماضی بعید کے حوالوں سے دیکھتی ہیں۔ مثلاً تاریخی مقامات کے حوالوں سے لکھی گئی نظموں میں شفیق فاطمہ شعریٰ کا یہ رویہ واضح ہے۔ نظم ''فصیل اورنگ آباد'' خلدآباد کی سرزمین، یا ایلورہ میں ان کا یہ رویہ خاصا واضح ہے۔ ان نظموں میں ماضی دور دراز تک پھیلے ہوئے واقعات ربط فکر کی دوڑ میں آپ میں سلیقہ سے بندھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب وہ اپنے افکار کی آمیزش سے ماضی بعید کے دھندلکے میں روشنی کو پیدا کر کے قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اب یہ ماضی بعید قاری کے لیے صرف ماضی نہیں رہتا بلکہ اس کے حال کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اس طرح شفیق فاطمہ شعریٰ حال کے تجربوں کو ماضی بعید کے حوالوں سے دیکھتی ہیں۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری کا ایک وصف جمیل ''زمانے'' اور وقت کے بارے میں ان کے مخصوص تصور ہے۔ وہ وقت اور زمانے کو عشق کے پس منظر میں بیان کرتی ہیں۔ کیونکہ عشق میں وہ جذبہ اور قوت ہے جو صرف انسان کی عظمت کا نشان ہے۔ عشق کے سہارے انسان زمانے اور وقت کو متاثر کرتا رہا ہے۔ عشق کی ماورائی قوت شفیق فاطمہ شعریٰ کی نظم ''ارض نغمہ'' میں نظر آتی ہے۔

اس کی ابتداء ازل اس کی انتہا ابد
درد مشترک کی دوا کی طویل داستاں
گاہ شمع انتظار گاہ نغمہ جرس
دھارتی ہے نت نئے روپ روح کارواں
زخمہ، خرام سے ساز راہ گذر میں

نت نئی نواؤں کا تازہ دم لہو رواں
اس لہو کی آگ میں منزلوں کی جھونک دیں
پیار کے لبوں میں آؤ سب دلوں کو جھونک دیں
(نظم ''ارض نغمہ'')

شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری سے وابستہ جو تخلیقی قوت ہے وہ ان کے باطن میں پوشیدہ اعلیٰ و ارفع روحانی بزرگی اور شائستگی کی پیدا کردہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اظہار بیان کے لیے افق تا افق کی وسعت بھی ان کے لیے ناکافی ہے۔ کیونکہ وہ جن موضوعات سے خود کو وابستہ رکھتی ہیں وہ محیط بے کراں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

حواشی

(۱) آفاق نوا: ایک جائزہ، از محمود ہاشمی

ادا جعفری

"ادا جعفری عہد حاضر کی وہ پہلی شاعرہ ہیں۔ جنہوں نے بقول احمد
پراچہ" اردو ادب کی تاریخ میں طبقہ نسواں کی شاعری کو اعتبار بخشا۔"(۱)

ادا جعفری 22 اگست 1926ء کو ہندوستان کے شہر بدایوں میں پیدا ہوئیں اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلی گئیں انکی شاعری دوسری جنگ عظیم کے بعد ابھر کر سامنے آنے والے ماحول میں پرورش پائی۔ اور اس لئے ان کی شاعری ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے۔ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی مرحلے اور بے اطمینانی و انتشار کے ماحول سے باہر نکل کر ایک آزاد فضا میں سانس لینے کی آرزو کا اظہار ملتا ہے۔ اور ایک ایسی منزل کی جستجو کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جہاں زندگی کی نئی قدریں ہوں جہاں آزادی اور مساوات ہو، ایک نئی دنیا کی تشکیل کا انتظار ان کی شاعری کا مرکزی موضوع بن جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے پہلے شعری مجموعہ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" کا عنوان اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں تلاش ہے ایک نئے ساز کی جو دنیا میں امن و محبت کے ایک نئے آہنگ سے آشنا کرے اردو شاعرات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے نجمہ رحمانی لکھتی ہیں:

''1949-50ء میں ادا جعفری کا مجموعہ ''میں ساز ڈھونڈتی رہی''
شائع ہوا اس کی اکثر نظمیں اس فرسودہ نظام زندگی سے بیزاری کا اعلان
تھیں جس نے معاشرے پر جمود کی کیفیت طاری کردی تھی۔''(۲)

''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' میں شامل بیشتر نظمیں اس جذبہ تلاش کا مظہر ہیں
جو ایک بے نام تغیر کے لئے بے تاب ہے۔ ملاحظہ ہوں چند مثالیں:

(1) ہائے یہ آرزوئے نا معلوم
ایک نالہ سا ہے بغیر آواز
ایک ہلچل سی ہے نہ سوز نہ ساز
روح میں انتشار سا کیا ہے
دل کو یہ انتظار سا کیا ہے

(احساس اولین)

(2) جسم آسودہ سہی روح مگر ہے بے تاب
ایک بے نام تغیر کے لئے
درد کی ٹیس سہی، لذتِ جاوید نہیں
نغمۂ امید نہیں
قہر ہے اُف یہ تسلسل یہ تواتر یہ جمود

(بیزاری)

اضطراب کی یہ کیفیت انہیں نئی منزلوں کی جستجو پر امادہ کرتی ہیں لیکن انہیں وہ

ساز دلنواز کہیں بھی نہ مل سکا جو ہمیں ایک سکون بے پایاں کا احساس کرا سکے:

میں ساز ڈھونڈنے لگی
میں ساز ڈھونڈتی رہی
میں محو جستجو رہی
مجھے وہ ساز دلنواز
آج تک نہ مل سکا

میں ساز ڈھونڈتی رہی'' میں شامل شاعری کا مطالعہ ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کی شاعری کا پہلا دور یاس و ناامید کے درمیان جھولتی زندگی کی عکاسی پر مشتمل ہے جہاں انفرادی سطح سے لے کر وطنی و بین الاقوامی سطح تک بے اطمینانی اور انتشار کی کیفیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔

بقول ڈاکٹر رشید امجد:

''ادا جعفری کی نظموں کی بڑی تعداد متنوع موضوعات و احساسات اور روایتوں کی نمائندہ ہے۔ حب الوطنی سے لے کر انسان کی ازلی و ابدی مسائل اور کائناتی وسعتوں کو چھونے کی تمنا چھوٹے بڑے دکھ مختلف احساسات جذبے اور فکر میں گندھ کر فنی خوبصورتیوں سے آراستہ ہو کر شعر میں ڈھلتے ہیں۔'' (۳)

ادا جعفری کی بیشتر نظمیں انسانی رشتوں کے حوالے سے اس کی اجتماعی آرزوں اور تمناؤں، جذبوں اور ولولوں کا ترجمان ہیں۔ اس میں قدیم اور فرسودہ نظام

زندگی کے خلاف بغاوت کا ایک بے پناہ جذبہ کارفرماں نظر آتا ہے اور ان کی آواز ایک سراپا طلب اور احتجاج بن کر ابھرتی ہے۔

ویسے تو اداؔ باضابطہ طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں ہیں لیکن ان کی شاعری میں ترقی پسندر جحانات کی آئینہ داری ہے۔

ملاحظہ ہو ان کی شاعری کا یہ رنگ:

راہ گذاروں میں یہ بہتا ہوا خوں
موت کے سائے میں سسکیاں بھرتی ہے حیات
اس اُمڈتے ہوئے طوفاں سے کنارا کرلوں
یہ سسکتی ہوئی لاشیں یہ حیات پردہ
یہ جبیں جنہیں سجدوں سے نہیں ہے فرصت
یہ امنگیں جنہیں فاقوں نے کچل ڈالا ہے
یہ بلکتی ہوئی روحیں یہ تڑپتے ہوئے دل
یہ ترستی ہوئی نظریں یہ ڈھلکتے ہوئے اشک
ان ڈھلکتے ہوئے اشکوں کو چرا کر میں بھی
اپنے ایوان تصور میں چراغاں کرلوں

واقعہ یہ ہے کہ اداؔ کی شاعری اپنے ماحول سے بغاوت اور نئی قدروں کی جستجو و آرزو پر مشتمل ہے لیکن انہیں کسی بھی نظریہ پر یقین نہیں کہ وہ ان کے خوابوں کی دنیا

کی تعمیر کر سکے گا یا نہیں وہ خود یہ کہتی نظر آتی ہیں کہ:

مگر میں ایک سوچ میں پڑی ہوئی ہوں آج بھی
وہ میری آرزو کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں
نظام نو بھی مجھ کو وہ ساز دے سکے گا یا نہیں

(میں ساز ڈھونڈتی رہی)

''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' میں شامل شاعری میں عصری رجحانات کی نقش گری ملتی ہے۔ اور ان کا یہ پہلا مجموعہ کلام ان کی فکری جہتوں اور جرأت اظہار کے مستقبل کی جولانیوں کا پیش خیمہ ہے۔

1968 میں ''شہر درد'' کے نام سے جب ان کا دوسرا مجموعہ سامنے آیا تو اس کا کینوس ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' سے زیادہ وسیع تھا۔ اپنے ایوان تصور میں چراغاں کرنے کی آرزو مستحکم نصب العین میں بدلتی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ فیض احمد فیض یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

> ''ادا بدایونی جو ساز ڈھونڈتی تھیں غالباً اب ادا جعفری کو شہر درد میں ہاتھ آ گیا۔ ادآ کے لہجے میں ایسا تعین اور ان کی آواز میں ایسی تمکنت ہے جو شاعر کو جہد اظہار میں اپنا مقام ہاتھ آنے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔''(۴)

اس مجموعہ میں شامل شعری نمونوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب وہ آس و یاس کے درمیاں جھولنے کے بجائے امید و یقین اور عزم استقلال کے ساتھ یہ کہتی

دکھائی دیتی ہیں:

غم رسیدہ نہ ہو آبدیدہ نہ ہو
قافلہ ہمیشہ رہا تیز رو
ایک مشعل بجھی دوسری جل گئی
اک مرجھا گئی اک کلی کھل اٹھی

یہ اقتباس اس بات کا ثبوت ہے کہ ''شہر درد'' کی شاعری اثبات زندگی کی شاعری ہے جیسا کہ اس مجموعہ کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں زمانے کے درد کی ترجمانی تو ملتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک عزم و حوصلہ ملتا ہے۔ چنانچہ نجمہ رحمانی لکھتی ہیں:

''اب وہ صرف ماضی اور حال کے بارے میں نہیں سوچتیں بلکہ ان کی آنکھوں میں ایک خوش آئند مستقبل کے خواب بھی جگمگا رہے ہیں۔ کائنات کے رموز سے آشنائی زندگی اور فن سے شناسائی تقریباً تمام غزلیات ونظموں میں جھلکتی ہے اب ان کے یہاں لہو رنگ آنسو اور اداسی کا دشت نہیں بلکہ حوصلہ اور عزم واستقلال موجود ہے۔ اپنے مستقبل کے تئیں ایک خوبصورت تصور ہے۔'' (۵)

شہر درد کی نظموں میں ایک خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ ایسے دور میں جب رشتوں کو ٹوٹنے اور بکھرنے کا سلسلہ جاری ہے خون کے رشتے بھی اپنی معنویت کھوتے جا رہے ہیں۔ ادا جعفری ''ماں'' کو ان ٹوٹتے رشتوں کی جوڑنے والی کڑی کی صورت میں پیش کرتی ہیں۔

اور سرگوشیاں کرتا ہے یہ ممتا کا جنوں
کٹ ہی جائے گا شب تار کا اک اور فسوں
دیکھ ناداں ہے نادان سے مایوس نہ ہو
آخر انسان ہے انسان سے مایوس نہ ہو

(ماں)

ماں جو تمام رشتوں کی بنیاد ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ان کی مختلف نظموں میں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اور یہیں سے اداؔ جعفری کی شاعری کا نسائی لب ولہجہ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ نسائی لب ولہجہ وہ ہے جو عورت کو مرد کے مد مقابل نہیں بناتا بلکہ ایک ماں کی حیثیت سے اسے وہ درجہ عطا کرتا ہے جس کے اوپر کوئی درجہ نہیں ہے۔

''ماں'' ادا جعفری کے یہاں ایک علامت ہے زندگی کی انسانیت کو پروان چڑھانے والی ہستی کی، نامساعد حالات میں بھی اپنی محنتوں کو ثمر آور بنانے والے حوصلے کی، خوابوں کی تعبیر و تعمیر کے جذبے کی:

اور سرگوشیاں کرتا ہے یہ ممتا کا جنوں
کٹ ہی جائیگا شب تار کا اک اور فسوں

ماں کی صورت میں عورت کو ادا جعفری نے اس کائنات کی لائق صد احترام شخصیت کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے:

زندگی لایزال و بے پایاں
میں تجھے اپنی زندگی کہہ دوں

''غزالاں تم تو واقف ہو'' ادا جعفری کا ایک اور مجموعہ کلام ہے۔ جو 1974ء میں شائع ہوا۔ یہاں ان کی شاعری ہر لمحہ ایک نئے افق کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ جہد مسلسل کو میراث آدم سمجھ کر نئی منزل کے جانب بڑھنے کی آرزو یہاں ان کی شاعری کا مرکز ومحور ان کا بنیادی موضوع بن کر ابھرتا ہے۔ اور انسانی فلاح و بہبود کے ایک باضابطہ نظریہ حیات کا احساس جاری وساری نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''مسجد اقصیٰ'' کا نام خاص طور پر لیا جاسکتا ہے۔

''مسجد اقصیٰ'' کا یہ بند ملاحظہ ہوں:

زندگی مرگ عزیزاں کو تو سہہ جاتی ہے
مرگ ناموس مگر ہے وہ دہکتی بھٹی
جس میں جل جائے تو خاکستر دل بھی نہ ملے
اور تپ جائے تو کندن ہے وجود انساں
پھر یہ پگھلے ہوئے لمحات گراں تابہ گراں
آپ منارۂ انوار میں ڈھل جاتے ہیں
عرش سے خاک نشینوں کو سلام آتے ہیں

یہ پوری نظم منارۂ انوار میں ڈھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جہاں جذبات

کی فراوانی اور الفاظ کی روانی ایک گہرا تاثر قائم کرتی ہے۔

ادا جعفری بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں۔ اور بقول رشید امجد:

''ان کے نظموں کی بڑی تعداد متنوع موضوعات احساسات اور رویوں کی نمائندگی ہے۔ حب وطن سے لے کر انسان کے ازلی و ابدی مسائل اور کائناتی وسعتوں کو چھونے کی تمنا چھوٹے بڑے دکھ مختلف احساسات جذبے اور فکر میں گندھ کر فنی خوبصورتیوں سے آراستہ ہو کر شعر میں ڈھلتے ہیں۔''(۶)

پہلا مجموعہ کلام ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' مطبوعہ 1950ء سے ان کا شعری سفر لگاتار آگے بڑھتا ہوا 1980 میں اس منزل پر پہنچتا ہے کہ ''ساز سخن بہانہ ہے'' کے عنوان سے ایک اور مجموعہ کلام ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ ساز سخن کی تلاش سے جو شاعری شروع ہوئی تھی وہ اس نتیجہ تک پہنچی کہ ساز سخن تو بہانہ ہے، اپنے جذبات احساس اور فکر و خیال کے اظہار کا، ''ساز سخن بہانہ ہے'' میں شامل شاعری میں جذبات کی سبک شیریں لہر اور الفاظ کی نرمی شامل ہے۔ یہاں انہوں نے اپنے مشاہدات کو من و عن بیان نہیں کیا ہے بلکہ تجربات و مشاہدات سے جو احساس ان کے دل پر مرتسم ہوا ہے اسے تخلیقی پیکر عطا کیا ہے۔

غزلوں میں بھی ان کے یہاں عصری حقیقتوں اور جذباتی رویوں کے حوالے سے ایک نئی دلکشی رعنائی اور ندرت فکر کا احساس نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

ہونٹوں کو مسکرانے کی عادت سی پڑ گئی

دل بھی کہے میں ہوتا تو کیا تھا برا ہمیں

ناز و وفا کا بت بھی ہمیں توڑنا پڑا

لوگو شکست دل سے بڑا سانحہ ہوا

غزل ایجاز و اختصار کا فن ہے اور ادآ نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ کلاسیکیت جو ان کی نظموں میں پائی جاتی ہے، غزلوں کا حصّہ بھی رہی ہے واقعہ یہ ہے کہ غزل میں ادا جعفری کا اپنا ایک خاص لب ولہجہ ہے جسے انہوں نے نسوانی سوچ اور نسوانی طرزِ احساس کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ غزل میں صیغہ تانیث کا استعمال کرتے ہوئے ایک جرأت مندانہ کے ساتھ اپنے واردات قلبی کا اظہار کر جانا ان کی انفرادیت ہے ملاحظہ ہوں اشعار:

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا

یوں جیسے میں کچھ رکھ کر کہیں بھول گئی ہوں

سر کی چادر بھی ہوا میں نہ سنبھالی جائے

اور گھٹا ہے کہ برسنے کا بہانہ چاہے

انجان نگاہوں کی یہ مانوس سی خوشبو

کچھ یاد سا پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے ہیں

1960 کے آس پاس جب جدیدیت کی تحریک شروع ہوئی تو فطری طور ادآ نے اس کا اثر بھی قبول کیا چنانچہ ان کی غزلوں میں بھی بے بسی، احساس تنہائی، وجود کی

شناخت کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ جیسے موضوعات کے تعلق سے بے شمار اشعار مل جاتے ہیں۔ یہ موضوعات وہ ہے جو جدیدیت کی تحریک میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں اشعار:

بے حس نہیں کہ سنگِ سر راہ جانیے
ساکت ہیں اہل ظرف غمِ آگہی لیے
کیا مطمئن ہیں بارِ غم زندگی لیے
جو باوجود مرگ تمنا بھی جی لیے

ان اشعار کے حوالے سے یہ بات بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں جدیدیت کی فلسفیانہ اساس کی جگہ ایک جذباتی بنیاد ملتی ہے۔ یہاں واقعہ یہ ہے کہ ترقی پسندی وجدیدیت سے الگ ہٹ کر ادا جعفری کی شاعری بدلتی ہوئی عصری حقیقتوں اور موضوعات پر طبع آزمائی کے حوالے سے پہچانی جائیگی جہاں ایک تازہ فکر ایک نئی دلکشی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ احمد پراچہ نے ان کی شاعری کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ”گذشتہ پانچ دہائیوں کے شعری سرمائے میں ان کا نام اور کلام سب سے الگ اپنا انفرادی ذائقہ رکھتا ہے۔ ان کے مجموعہ ہائے شعری میں ان کی شاعری مسلسل ارتقائی اور ترقی کا واضح پتہ دیتی ہے“۔

اور یہی وجہ ہے کہ ادا جعفری کی شاعری میں محبتوں چاہتوں اور دعاؤں سے لبریز عورت کا جو وجود ابھر کر سامنے آتا ہے وہ نسائی احساسات سے بھرپور ہے۔

حواشی

1۔ پاکستانی اردو ادب اور اہل قلم خواتین، احمد پراچہ

2۔ آزادی کے بعد اردو شاعرات، نجمہ رحمانی، ص 66

3۔ نئے زمانے کی برہمن، رشید امجد، 1990ء بحوالہ پاکستانی اردو ادب اور اہل قلم خواتین

4۔ بحوالہ۔ انتخاب سخن، فیض احمد فیض، ص 8

5۔ آزادی کے بعد اردو شاعرات، نجمہ رحمانی، ص 69

6۔ پاکستان کی اردو شاعرات مشمولا عبارت، راولپنڈی، 1997ء

○

زہرہ نگاہ

ادا جعفری کی طرح زہرہ نگاہ کا شمار بھی ان شاعرات میں ہوتا ہے۔ جن کی شاعری گرچہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پروان چڑھی لیکن زہرہ نگاہ نے اپنے نسائی طرز احساس اور انداز فکر سے بہت جلد اپنی انفرادیت کی راہ نکالی۔ ''شام کا پہلا تارہ'' کے نام سے انکا پہلا شعری مجموعہ جب منظر عام پر آیا تو ایسا محسوس ہوا کہ شام کے دھندلکوں میں ایک امید کا تارہ نظر آیا ہو۔ ایک ایسے دور میں جب دنیا دوسری جنگ عظیم کے بعد انتشار سے دو چار تھی فلسطین، ویتنام، افریقہ ہر طرف ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ زہرہ نگاہ کی نظمیں امید کی کرن بکھیرتی نظر آتی ہیں۔ ''ایک بچے کا گیت'' میں ویتنام میں پیدا ہونے والے بچے کے زبان سے وہ یہ کہتی دکھائی دیتی ہیں۔

کب کھیتوں میں دوڑ کے میں بھی ہوا کے جھونکوں کو چوموں گا

اور کب چاند کی ٹھنڈک کو میں اپنے ہاتھ سے چھولوں گا

میں نے سنا ہے

مجھ کو یقین ہے

اس دنیا میں سورج چاند ہوا پر کوئی قید نہیں ہے

عالمی اور ملکی حالات پر ان کی دیگر نظمیں مثلاً جرم، وعدہ، ایک پرانی کہانی، دیوار، جنوبی افریقہ وغیرہ ایسی نظمیں ان کی ترقی پسندانہ فکر کی ترجمانی کرتی ہیں جہاں ظلم و استبداد سے نجات حاصل کرنے کی خواہش کے ساتھ مستقبل سے وابستہ روشنی کی کرن پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔

بقول نجمہ رحمانی

"ان نظموں میں یقین اور حوصلے کی مضبوطی ہے ایک تیز تلخ لہر کے ساتھ مستقبل سے وابستہ امید نے انہیں قنوطیت اور مرگ پرستی سے بچا لیا ہے۔"(۱)

ان کی غزلوں میں بھی اپنے زمانے کے سیاسی شعور کی لہر کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی غزلوں کے اکثر اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ وہ اپنے عہد کا شعور رکھتی ہیں۔ اپنی گردوپیش کی دنیا سے واقف ہیں اور نہ صرف اپنے حالات کو سمجھتی ہیں بلکہ انہیں بیان کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔

زہرہ نگاہ کی شاعری کا یہ ترقی پسندانہ مزاج ان کی غزلوں میں بھی نظر آتا ہے چنانچہ ان غزلوں میں غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کی کسک کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

جہانِ نو کا تصور حیات نو کا خیال
بڑے فریب دئے تم نے بندگی کے لئے
حکایت غم دنیا طویل تھی کہہ دی
حکایت غم دل مختصر ہے کیا کہیے

کلی اداس چمن سوگوار گل خاموش
یہ انتظار بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو

ان اشعار کو پڑھتے ہوئے بے ساختہ محسوس ہوتا ہے کہ زہرہ نگاہ نے فیض سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ چنانچہ ترقی پسندی و رومانیت کے امتزاج سے ان کے یہاں ایک سحر آفریں کیفیت پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن زہرہ نگاہ کی شاعری کو جو انفرادیت بخشتی ہے وہ ان کا نسائی طرز احساس ہے بقول احمد پراچہ:

"زہرہ نگاہ نے اپنے نسائی طرز احساس اور طرز فکر سے اپنی انفرادیت کی راہ لی"۔(۲)

واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کی تلخ و شیریں تجربات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ایک عورت کے وجود کی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی کی ہے۔ یہ عورت کبھی محبوب کبھی بیوی تو کبھی ماں کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اس لئے ان کی غزلوں میں ایک الھڑ لڑکی کی تصویر نظر آتی ہے جس کے

ہاتھوں کی بانکیں چھن چھن چھن ہنستی تھیں
پیروں کی جھانجھن کو غصہ آتا ہے

دوسری طرف وہ عورت ہے جو گھر کی چھوٹی بڑی الجھنوں کو سلجھانے میں لگی ہے مگر

جگ مگ جگ مگ سونے جیسا
گھر سب کی نظروں میں آیا

بھیگا آنچل پھیلا کاجل
کس نے دیکھا کس نے چھپایا

یہ وہ عورت ہے جو اپنے دل کی تمام آرزوؤں کو دل میں دفن کر کے مرد کے ساتھ زندگی کا سمجھوتہ کر لیتی ہے جس کی وجہ سے اس کی اپنی شخصیت اپنا وجود اپنی شناخت کھو چکی ہے۔ آج بھی آزادیِ نسواں کے تمام تر دل فریب نعروں کے باوجود خود عورت بھی اپنے گرد کے روایات کے شکنجے کو نہیں توڑ سکی۔

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر
یہ چادر میں نے برسوں میں بُنی ہے
اسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا
اسی سے تم بھی آسودہ رہو گے
نہ خوش ہو گے نہ پژمردہ رہو گے

(سمجھوتہ)

''سمجھوتہ'' کے علاوہ ''بن باس'' ''گل چاندنی'' ''آج غمگین نہیں حیراں ہیں ہم'' ''سوچتی ہوں اپنے راستے لوٹ جاؤں'' وغیرہ ایسی نظمیں خالص نسوانی جذبات کی غمازی کرتی ہیں زہرہ نگاہ کے جذبات کے اظہار کے سلسلے میں ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

ملگجے کپڑوں پہ اُس دن کس غضب کی آب تھی
سارے دن کا کام اُس دن کس قدر ہلکا لگا

میں تو اپنے آپ کو اس دن بہت اچھی لگی
وہ جو تھک کر دیر سے آیا اسے کیسا لگا

یہاں عورت کی روزمرّہ کی زندگی اور اس کے جذباتی معاملات جس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہو کر سامنے آتے ہیں وہ قابلِ توجہ ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔

''زہرہ نگاہ اپنی شاعری میں گھر کی بنیادوں میں وفا کے رشتوں کی تہذیب کرتی اور رفاقتوں کو نئے معنی پہناتی ہیں۔ رفاقتوں اور محبتوں کے اس سفر میں زہرہ نگاہ کے یہاں روایتی عورت کے سبھی روپ نظر آتے ہیں۔''(۳)

زہرہ نگاہ کے یہاں نسائی جذبات کے اظہار کے نام پر نوعمری کے کچے پکے خیالات اور جسم کی ضرورتوں کا اظہار نہیں ملتا ہے۔ بلکہ ایک ایسی عورت ملتی ہے جو گھر آنگن کے رشتوں میں گھری ہوئی اس استحصالی معاشرے کی کڑی دھوپ میں کھڑی یہ سوچ رہی ہے:

تم نے بات کہہ ڈالی کوئی بھی نہ پہچانا
ہم نے بات سوچی تھی بن گئے ہیں افسانے

زہرہ نے عورت کی زندگی کے ان حسین لمحات کو بھی پیش کیا ہے جو اس کی زندگی کا انمول سرمایہ ہوتے ہیں۔

ہوا سکھی تھی میری رُت ہمجولی تھی
ہم تینوں نے مل کر کیا کیا سوچا تھا

یہ نسوانی لہجے کی ایک متوازن آواز ہے۔ اپنی نظموں میں وہ ایک ماں کے روپ میں بھی سامنے آتی ہیں۔

میرے بچے ہزار بار میں نے تم کو اپنا ایک قصہ سنایا ہے
کہیں لوری کے آنچل میں کہیں بانہوں کے جھولے میں
تمہیں بہلا کے لپٹا کے سلایا ہے

یہ تحفظ جو عورت کو ماں کی صورت میں ملتا ہے۔ کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔ ممتا کا ایک شگفتہ اور اٹوٹ جذبہ زہرا نگاہ کی شاعری کی جان ہے۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد:

''زہرہ نگاہ اپنی شاعری میں گھر کی بنیادوں میں وفا کے رشتوں کی تہذیب کرتی اور رفاقتوں کو نئے معنی پہناتی ہیں۔'' (۴)

رفاقتوں کے اس سفر میں جہاں عورت کے وجود کا احساس ملتا ہے وہیں ترقی پسندانہ رویّوں کے خدوخال بھی ملتے ہیں بقول فیض احمد فیض:

''اس کلام میں روزمرہ کی زندگی کے جذباتی معاملات بھی ہیں ۔۔۔۔ سیاسی واقعات کے تاثرات بھی وہ وعدہ بھی جو کہ انسانوں کی تقدیروں میں لکھا ہے'' ۔ (۵)

○

حواشی

1۔ آزادی کے بعد اردو شاعرات، نجمہ رحمانی، ص 64
2۔ پاکستان کی اردو شاعرات مشمولہ عبارت، راولپنڈی، 1997ء رشید امجد
3۔ پاکستان کی اردو شاعرات مشمولہ عبارت، راولپنڈی، 1997ء رشید امجد
4۔ بحوالہ پاکستانی اردو ادب اور خواتین، فیض احمد فیض، ص30

کشور ناہید

ادا جعفری اور زہرہ نگاہ نے جس نسائی لب ولہجہ کو پروان چڑھایا تھا وہ آگے چل کر کشور ناہید کے یہاں مزید بالیدگی اختیار کر لیتا ہے۔ کشور ناہید بھی ہندوستان کے ایک مشہور بلند شہر میں پیدا ہوئیں۔ اور تقسیم ہند کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آگئیں اور بقول احمد پراچہ:

> ''قیام پاکستان کے بعد جدید نظم گو شاعرات کی جو تازہ کھیپ سامنے آئی اس میں کشور ناہید اردو نظم کی ایک معتبر شاعرہ کی حیثیت سے ایک جداگانہ شناخت رکھتی ہیں۔''(۱)

کشور ناہید نے اپنی شعری سفر کا آغاز ''لب گویا'' سے کیا جو غزلوں پر مشتمل ہے ابتدائی دور سے ہی کشور ناہید کے یہاں نسائیت ایک غالب رجحان کی صورت میں موجود ہے۔ یہ نسائیت ایک الھڑ دوشیزہ کے جذبات کی عکاسی پر مشتمل ہے۔ ایک ایسی لڑکی جو ابھی اپنے بچپن کو نہیں بھولی ہے۔ جس کے دل میں عنفوان شباب کی انگڑائیاں بھی موجزن ہیں۔ ایک طرف تو اس کی نگاہیں کسی کی نگاہوں کا سامنا کرنے کی تاب نہیں رکھتیں لیکن دوسری طرف اس کی نگاہیں کسی کو ڈھونڈتی بھی ہیں۔ کسی سے ملاقات کی خواہش اسے تڑپاتی بھی ہیں۔ ایک دبی دبی تمنا اور وصال کی آرزو کا اظہار ایک

دلگداز کیفیت سے دو چار کرتا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

کھلونے ٹوٹتا دیکھوں تو آنکھ بھر آئے
ابھی تک نہیں بھولی ہے زندگی بچپن

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
سر کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

جہاں الھڑ دوشیزہ کی جذباتی کشمکش کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ شرمیلی سی لڑکی اچانک جب اپنے جذبات کا اظہار کر بیٹھتی ہے تو اسے ایک قابل تعزیر جرم دیا جاتا ہے۔

کشور ناہید نے اس جذباتی کشمکش، جنسی کشش اور خوف، اظہار کی زبردست خواہش اور ماحول کی جبریت کو کلاسیکی لب ولہجہ میں ڈھال کر غزل کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا ہے۔ ملاحظہ ہوں اشعار:

قریہ ضبط میں تنہا ہوں میں
خواب کے جسم میں تیشہ ہوں میں

طلب کی دشت نے دیوانگی مقدر کی
شفق کے روپ میں اب تک آبدیدہ ہوں

وہ ماہ وسال کی شاخوں میں چھپ کے دیکھتا ہے
میں آئینے میں اُسے دیکھ کے جیدہ ہوں

محبتیں خوب ہیں خوش وقتی غم کی خاطر
کوئی ایسا ہو جسے جان و جگر سے چاہوں

غزل کے ان اشعار میں جہاں نسائی جذبوں کی سچائی اور تیکھا پن ہے وہیں عورت کے جذبات کی کشاکش کا اظہار بھی ہے۔ لیکن یہ عورت وہ عورت ہے جس کا شعور اب بیدار ہورہا ہے۔ وہ کرب آگہی سے دوچار ہے اور اب اپنے گردوپیش کو مرد کی نہیں بلکہ اپنی نظر اپنے حوالے سے دیکھنے کی آرزومند ہے۔ جو صدیوں سے سسکتے نسوانی وجود کو ایک نئے حوصلے اور ہمت عطا کرنے کی خواہاں ہے۔ اس لئے فرسودہ اور کرم خوردہ نظام زندگی کی پابندیوں سے خود کو آزاد کرلینے کا جذبہ لئے روایت سے بغاوت کا اعلان کردینا چاہتی ہے ایسے میں وہ یہ کہتی دکھائی دیتی ہے۔

میری ہنسی کے صنوبر سے ڈر گئے وہ لوگ
کہ جن کے دل میں شب زہر کا بسیرا تھا

میں نظر آؤں ہر اک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں
میں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
میں اسے چاہوں تو اپنی ہی خبر سے چاہوں
مردوں کو سب روا ہے یہ عورت کو ناروا
شرم و حیا کا شہر میں چرچا بھی ہے عجب

آگے چل کر ''گلیاں دھوپ دروازے'' اور ''مسافتوں کے درمیان'' میں شامل غزلیں سامنے آئیں تو اس میں ہمیں یہ عورت اب ایک باشعور عورت کے روپ میں نظر آتی ہے۔ حالانکہ اس کی سوچ ابھی بھی مشرقی ہے لیکن حالات ماحول و جذبات کو وہ اپنے تجربات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کے مطابق اپنے ردِعمل کا اظہار بھی کرتی ہے اس لئے یہاں ایک طرف تو ازدواجی زندگی کی الجھنوں کا کھل کر اظہار ہے اور دوسری طرف گھٹن سے باہر نکلنے کے لئے اٹھتے قدم کی نشاندھی ملاحظہ ہوں چند اشعار:

اب کچھ کچھ سمجھی ہے دنیا کو ناہیدؔ
اب کی بار نہیں مانی بہلانے سے
تو کہ جس کی منکوحہ ہے
ایک بدن کے چالیس چہرے
وہ اپنی دھوپ مرے انگنوں میں پھیلا کر
سمجھ رہا ہے کہ میں حدت قرار میں ہوں

جاگتے میں لکڑی کی طرح سلگتی ہوں
اور سوتے میں چلتی ہو اسے لڑتی ہوں
شہید جذبوں کی قبریں سجا کے کیا ہوگا
کھنڈر ہوں قامت شب ہوں بدن دریدہ ہوں

یہ اشعار عورت کی محرومی اور مظلومی کی طویل داستان کو اپنے میں سموئے ہوئے ہے نسائی جذبات کو غزل کا لب ولہجہ عطا کرنے کا ہنر ان کی غزلوں کو نئی شناخت دیتا ہے۔

ویسے کشور ناہید کا اصل جوہر ان کی نظموں میں جھلکتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو شاید زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اصلاً نظم کی شاعرہ ہیں۔ چنانچہ بے نام مسافتیں کے نام سے شائع ہونے والے ان کے دوسرے مجموعہ میں شامل نظموں کا مطالعہ ان کی فنی شناخت کو مزید استحکام بخشتا ہے اور ایک ایسی بدلتی ہوئی حساس عورت کی تصویر پیش کرتا ہے جو اپنی ماں کی طرح نہیں سوچتی بلکہ یہ کہتی دکھائی دیتی ہے:

ہماری ماں نے ہمیشہ روٹی پکائی ایسے
کہ ایک تھا پیٹ میں تو اک
گود میں ہمکتا
مگر نہ حرف گراں کبھی اس کے لب پہ آیا
اگر یونہی میری ماں کی صورت

مری کمر بھی جھکی تو کوئی ساتھ نہ دے گا

نا ممتا کے مزار پر فاتحہ پڑھے گا

غرض کے بندھن ہیں سارے رشتے

نہ ممتا دلار کچھ ہے

نہ تیرا میرا ہی پیار کچھ ہے

(آ گہی)

اس نظم کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ادا جعفری اور زہرہ نگاہ کے یہاں عورت کی تمام تر مظلومیت کے باوجود یہ احساس ملتا ہے کہ ایک ماں ہی ایسا رشتہ ہے جو عورت کو عظمت بخشتا ہے۔ لیکن کشور ناہید کے یہاں اس رشتے کا تقدس بھی پامال نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عورت کے لئے تمام رشتے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ عورت کی بے چارگی کا یہ احساس کشور ناہید کی نظموں کا بنیادی موضوع ہے۔ آہستہ آہستہ یہ عورت اپنی بے چارگی کا لبادہ اتار کر پھینکنا چاہتی ہے۔ اور یہ کہتی دکھائی دیتی ہے۔

کشور ناہید

تمہیں خاموش دیکھنے کی چاہت

قبروں سے بھی اُمڈی آرہی ہے

مگر تم بولو!

کہ یہاں سننا منع ہے
مجھے جن جذبوں نے خوفزدہ کیا تھا
اب میں ان کے اظہار سے
دوسروں کو خوف سے لرزتا دیکھ رہی ہوں

(کشور ناہید)

کشور نے یہ قوت گویائی حاصل کر کے تہذیب کے چہرے پر پڑی نقاب کو اپنے قلم سے تار تار کیا ہے۔ چنانچہ 1971 میں ان کا جو شعری مجموعہ منظر عام آیا تو عورت کو ایک بڑے کینوس میں دیکھنے کی ایک نئی جہت ابھر کر سامنے آئی بقول سلیم اختر:

''بے نام مسافت مطبوعہ 1971ء میں کشور ناہید نظموں میں نسوانیت اور اس کے حوالے سے پاکستانی عورت کی سائیکی ایکسپوز کرتی نظر آتی ہے۔ جذباتی گھٹن تشنگی اور ان سب کے نتیجہ میں تناؤ سے چیختے اعصاب بے نام مسافت کے شعری سفر کے عنوانات مہیا کئے ہیں۔'' (۲)

اسی طرح 1973ء میں چھپنے والے مجموعہ ''گلیاں دھوپ دروازے'' اور 1981ء میں شائع ہونے والے مجموعہ ''علامتوں کے درمیان'' میں کشور ناہید نے مزید گہرائی میں جا کر عورت کی سائیکی کے پر اسرار نہاں خانوں میں جھانکا ہے اور وہاں سے اپنے لئے تخلیقی محرک حاصل کیا ہے۔ احمد پراچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بے نام مسافتوں کی پہلی نظم ''عروسی'' جبکہ گلیاں دھوپ دروازے
میں ایک نظم ہے ''رات آتی ہے''۔ یہ دونوں نظمیں اکٹھی پڑھیں جائیں تو
آج کی عورت کی تشنگی اور محرومیت کی تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔''

ایک طرف تو کشور ناہید نے گھریلو عورتوں کی الجھنوں اور مشرقی عورتوں کی محرومیوں کی داستان پیش کی ہے تو دوسری طرف آزادی نسواں کے نام پر عورتوں کا جو استحصال ہو رہا ہے اس پر بھی نظر ڈالی ہے۔ پوسٹروں پر ریڈیو پر ٹیلی ویژن پر عورت کی آواز اس کے جسم اس کی شخصیت کو اپنی تجارت کا ذریعہ بنا کر آزادی کے نام پر استحصال کی جو صورت سامنے آرہی ہے اس کے خلاف نفرت کا اظہار ان کی نظم ''میں کون ہوں'' میں جس طرح سے ہوا ہے وہ بے مثال ہے۔

عورت کا استحصال جب حد سے گذر جاتا ہے تو ذہن میں پلتی ہوئی نفرت شدت اختیار کر لیتی ہے تو پھر ''آخری فیصلہ'' کی صورت میں ایک نظم میں یہ خیالات اظہار پاتے ہیں:

میرا جی کرتا ہے
وہ سب جو میرے قاتل ہیں
میں انہیں
ہوا کی طرح نگل جاؤں

(آخری فیصلہ)

نجمہ رحمانی نے لکھا ہے:

''صدیوں سے گھٹتی سسکتی عورت نے کشور ناہید کے یہاں قوت گویائی حاصل کر لی ہے یہ مزاج دراصل جدید عورت میں ابھرتے ہوئے احساس کے نئے رنگوں کا عکاس ہے۔ زندگی کی ایک نئی جہت کی دریافت عورت کی بے کسی کم مائیگی سے نفرت اور خاموشی کی زنجیروں کو توڑ آنے کی سعی ہے۔''

ان تمام موضوعات کے علاوہ کشور ناہید کے یہاں سماجی معاشرتی اور قومی حوالے سے بھی موضوعات کی فراوانی ہے۔ چنانچہ سانپ'' کینچلی'' ''خلوت زخم'' ''نائٹ میئرز'' ''دفعہ 144'' تقریر 221 جیسی نظمیں اس کی بہترین مثال ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی غزلوں کے یہ اشعار بھی قابل توجہ ہیں:

بدن کو سر سے جدا دیکھنے کی فصل ہے یہ
نجیب شہر کا گلشن سے دوستانہ نہیں

پتھر میں لہو چمک اٹھے گا
دیوانے کے ہونٹ کاٹنے سے

در اگر بند ہوں دیوار گرادیگا
دل کا سیلاب کناروں سے نکلنا چاہے

بندھے ہیں پیٹ سے بچے بھی اور پیسے بھی
زمیں کی بیٹی کی تصویر دیکھ کر جانا

ان نظموں اور غزلوں کے حوالے سے کشور ناہید کے یہاں ایک نئی آگہی اور ایک نئے جذباتی منظر نامے کی تصویر ابھرتی ہے۔ شاید اسی لئے شمیم حنفی نے اسے اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:

''اس کے ہاتھوں میں ایک نیا اعلان نامہ ہے زندگی ایک نئے نظم کی تلاش اور تمنا کا مشرقی عورت کی تقدیر پرستی ہزیمت زدگی اور انفعال سے اسے نفرت ہے۔ حیا اور ایثار کے بہانے اپنے جوہر کے اخفا یا ذات کے زیاں کو قبول کرنے پر وہ آمادہ نہیں۔ اس گرداب سے نکلنے کی جستجو اسے ہلکان رکھتی ہے۔ اب وہ ہوا کے وحشی جھونکے کی مانند زنداں سے باہر کھلی فضاؤں میں پرواز کی متمنی ہے۔''(۳)

○

حواشی

1۔ پاکستانی اردو ادب اور اہل قلم خواتین، احمد پراچہ، ص 42
2۔ تخلیقات اور تخلیقی رویے، ڈاکٹر سلیم اختر، بحوالہ رابطہ
3۔ رات کے مسافر، شمیم حنفی، ص 92

فہمیدہ ریاضؔ

ادا جعفری، زہرہ نگاہ اور کشور ناہید سے ہوتے ہوئے جب ہماری نگاہ فہمیدہ ریاضؔ پر جاتی ہے تو واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مرد اساس معاشرے کی تمام قدروں کو توڑ کر اور سارے بندھنوں سے آزاد ہو کر عورت اپنے وجود کی بالادستی تسلیم کرانا چاہتی ہے۔ اب تک جو نسائی لب ولہجہ ابھر کر سامنے آیا تھا اس سے الگ ہٹ کر تانیثیت یہاں ایک سراپا احتجاج بن کر ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔

ہندو پاک کی خواتین شاعرات میں منفرد لب ولہجہ کی بنا پر فہمیدہ ریاضؔ اپنی پہچان آپ رکھتی ہیں۔ فہمیدہ ریاضؔ کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے ہے۔ انہوں نے 1945ء میں اس جہانِ رنگ و بو میں قدم رکھا اور پھر حالات کے جبر نے انہیں مہاجرت اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ انہوں نے پاکستان کو اپنا وطن بنا لیا لیکن ہندوستانیت ان کی رگ و پے میں کچھ اس طرح رچی بسی تھی کہ وہ اس سے خود کو الگ نہیں کرسکتی تھیں۔ ہندوستانی دھرتی کی مٹھاس اس کی شاعری میں رس گھولتی رہی۔

ہائے وہ پہلی پہلی برکھا
سوندھی کھلے گلاب کی باس

جس کا میٹھا میٹھا موہ

جس میں رچا سکو رماس

(ساون بیت گیا)

یہاں جو رچاؤ اور اثر انگیزی ہمیں دکھائی دیتی ہے وہ فہمیدہ ریاض کا امتیاز ہے۔ اور یہ سبھی چیزیں انہیں ممتاز بناتی ہے۔ اردو شاعری میں ان کی انفرادی شناخت قائم کرتی ہے۔ ان کا نسائیت سے بھرپور لہجہ عورت کی انفرادی شناخت کے حصول کی تڑپ کے روپ میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ فہمیدہ ریاض نے جس زمانے میں شاعری شروع کی وہ زمانہ عورتوں کے لئے مساوی حقوق کی طلب اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد کا زمانہ تھا۔ یہ جدوجہد فہمیدہ ریاض کے یہاں ایک جرأت مندانہ اقدام کی صورت میں اظہار پاتی ہے۔

فہمیدہ ریاض نے اپنی شاعری میں سیاسی اور سماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ سائنسی اور میکانیکی موضوعات، مناظر فطرت، انسان دوستی اور نفسیاتی اور جنسی موضوعات کو بھی باندھا ہے لیکن ان کی شاعری کی مرکزی فکر "عورت" اور اس سے متعلق مسائل ہیں۔ ان کے یہاں عورت کی زندگی سے متعلق مختلف موضوعات پر کثرت سے نظمیں موجود ہیں۔ اگر ان کے کلام کو تاریخی اعتبار سے تجزیہ کیا جائے تو عورت کی حسیت کے تعلق سے ان کے یہاں فکری ارتقا صاف نظر آتا ہے۔ ''پتھر کی زبان'' (1967ء) سے ''آدمی کی زندگی'' (2000ء) تک کے سفر میں ایک نوعمر لڑکی

سے ایک مکمل عورت بننے کا عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ حالانکہ موضوعات کے تنوع اور زبان و انداز بیان میں تبدیلی کی وجہ سے ان کے سارے مجموعے ایک دوسرے سے جدا نظر آتے ہیں لیکن "عورت کی حسیّت کا اظہار" ایک ایسی کڑی ہے جو ان کی شاعری میں تسلسل قائم کرتی ہے۔

فہمیدہ کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''پتھر کی زبان'' صرف 21 برس کی عمر میں شائع ہوا۔ ''پتھر کی زبان'' کی زیادہ تر نظمیں ایک نوعمر لڑکی کے خوابوں اور اس کے تصور کی حسین دنیا کی عکاسی کرتی ہیں۔ جذبۂ عشق، تمنائے وصل، تنہائی کا احساس، اداسی اور خوابوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے سبب پیدا ہونے والی مایوسی، اس کی نظموں کے موضوعات ہیں۔ اس مجموعے میں شامل ایک نظم ''جھجھک'' کی یہ سطریں ملاحظہ ہوں:

یہ مری سوچ کی انجان کنواری لڑکی
غیر کے سامنے کچھ کہنے سے شرماتی ہے

اپنی مبہم سی عبارت کے دوپٹے میں چھپی
سر جھکائے نظریں کترا کے نکل جاتی ہے

(جھجھک۔ پتھر کی زبان)

ان تمام آرزوں اور تمناؤں کے باوجود ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جس میں بے بسی کا احساس بھی رواں دواں ہے۔ یہ احساس اس بات کا ہے کہ سماجی بندھنوں کا

حصار اس کے خوابوں کی تکمیل میں حائل ہے۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ:

جھلملاتے ہیں جو احساس میں ننھے جگنو
وقت کی آنکھ میں رہ جائیں گے بن کے آنسو

اس کے باوجود اس کی یہ خواہش ہے کہ:

یہ ڈھلتی رات ستاروں کی
بیتے نہ کبھی ۔۔۔۔۔تم سو جاؤ
اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو

بے بسی کے تمام تر احساس کے باوجود کسی کو پانے کی تمنا اسے نیا حوصلہ بخشتی ہے اور وہ کہتی ہیں:

نہ امید کوئی نہ کوئی سہارا
میری بے بسی مجھ پر ظاہر ہے لیکن
تمہاری تمنا! تمہاری تمنا!

(تمنا)

لیکن اس کے ساتھ اس میں ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو فہمیدہ ریاض کے مزاج کا دھندلا سا عکس پیش کرتی ہیں۔ ''گڑیا''، ''لمبے سفر کی منزل''، ''زادے راہ'' وغیرہ یہ سبھی نظمیں سماج میں پنپتی ہوئی بے چارگی، عورت کے حقوق کا استحصال موجودہ نظام

سے بیزاری کا عکس ہیں۔

طویل رات نے آنکھوں کو کر دیا بے نور
کبھی جو عکس سحر تھا سراب نکلا ہے
سمجھتے آئے تھے جس کو نشاں منزل کا
فریب خوردہ نگاہوں کا خواب نکلا ہے

(لمبے سفر کی منزل)

اگرچہ استعاراتی زبان پر فہمیدہ ریاضؔ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان کا انداز بے باکانہ ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو وہ بے حجابی کی سرحدوں کو جا چھوتا ہے اور یہ بے حجابی اور بے باک پن انہیں ایک الگ مقام عطا کرتی ہیں۔ فہمیدہ ریاضؔ نے جس بے باکی کے ساتھ جنس کے تعلق سے اظہار کیا ہے وہ کسی اور شاعرہ کے یہاں نہیں ملتا اور یہی وجہ ان کی شناخت کا وسیلہ بنا ہے۔

آزادی کے بعد اردو شاعرات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے نجمہ رحمانیؔ نے اس بات کا ذکر کیا ہے:

"بیان کی آزادی جواب تک صرف مردوں کا حصہ تھی فہمیدہ ریاضؔ نے عورت ہوتے ہوئے بھی اس کا استعمال کیا۔ غالباً اسی لئے کچھ لوگوں نے ان پر فحش گوئی کا الزام عائد کیا ہے۔" (۱)

چنانچہ آگے چل کر جب فہمیدہ ریاضؔ کا دوسرا شعری مجموعہ "بدن دریدہ" کے

بے گراں ریگ میں سب گرم لہو جذب ہوا

دیکھ چادر پہ مری ثبت ہے اس کا دھبّا

(باکرہ)

اور یہاں تک وہ کہنے سے نہیں گریز کرتی ہیں:

کتابیں بدل دو!

یہ جھوٹی کتابیں

جو ہم پڑھاتے چلے آ رہے ہیں

حقیقت کے رخ سے

یہ بے معنی فرسودہ لفظوں کے پردے

ہٹا دو

اب نہ روکو اسے

آزاد تصور کو کر دو

ذہن کو سوچنے دو

اور تخیل کو بھٹکنے دو ذرا

''بدن دریدہ'' کی بہت سی نظموں میں فہمیدہ ریاضؔ نے جنسی تجربات بھی قلم بند کیے ہیں۔ جیسے اس نظم میں:

نام سے منظر عام پر آیا تو وہ قیامت برپا ہوئی کہ ان کی شخصیت ہی متنازعہ بن گئی۔

بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

"وہ مضبوط اعصاب کی عورت نکلیں کہ یہ سب کچھ سہہ گئیں۔"(۲)

"بدن دریدہ" کی نظموں سے پتا چلتا ہے کہ اس مجموعہ میں فہمیدہ ریاض کا شعور پختہ ہو گیا ہے۔ ان کے یہاں عورتوں کے مساوی حقوق کے لئے جو تڑپ ہے وہ بیشتر کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ عورت جو سماج کی ایک اہم اکائی ہے پھر بھی اسے وہ رتبہ نہیں ملا ہے جو اسے ملنا چاہئے تھا۔ سماج نے مردوں کو ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے۔ مرد کے ہر جرم اور گناہ کو روا سمجھا گیا ہے۔ عورت جو مرد کی نصف بہتر ہے اسے اس کے حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ اس کی وفا اور تقدس کا ثبوت مانگا گیا ہے اور اسے اگنی پریکشا دینی پڑتی ہے۔ نظم "باکرہ" میں فہمیدہ ریاض کا غصہ اور نفرت پورے شباب پر نظر آتا ہے۔ اور وہ اس نظم کے ذریعہ اس نابرابری اور عدم مساوات کے خلاف آواز بلند کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اسکی ابلی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک ہے چمک
اور سیہ بال ہیں بھیگے ہوئے اب تک
ترا فرمان تھا یہ اس پہ کوئی داغ نہ ہو
سو یہ بے عیب اچھوتا بھی تھا ان دیکھا بھی

زبانو کے رس میں یہ کیسی مہک ہے

یہ بوسہ کہ جس سے محبت کی صہبا کی اڑتی ہے خوشبو

یہ بدمست خوشبو جو گہرا غنودہ نشہ لا رہی ہے

یہ کیسا نشہ ہے

(زبانوں کا بوسہ)

بیان کی آزادی جواب تک مردوں کے حصے میں تھی۔ فہمیدہ ریاض نے عورت ہوکر اس کا استعمال کیا ہے اور عورت کے ان احساس اور جذبات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ان جنسی تجربات کو موضوع سخن بنایا جن کے اظہار کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے ان پر فحش گوئی کا الزام لگایا ہے۔ لیکن یہ کوئی وجہ نہیں ہے۔ آج جس سماج میں ہم رہتے ہیں وہ کسی مرد کی اساس نہیں ہے۔ پھر کسی عورت کے ساتھ یہ رویہ کیوں؟ آج ساری دنیا عورت اور مرد کی مساوات کی باتیں کررہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی اس کی آواز کو دبانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بہرحال فہمیدہ ریاض نے جس بے باکی کے ساتھ جنس کے تعلق سے اظہار کیا ہے اس نے جہاں ان کو متنازعہ بنادیا وہیں ان کی شناخت کا وسیلہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ احمد پراچہ لکھتے ہیں کہ:

''فہمیدہ ریاض کے یہاں جسم کی پکار خاص نمایاں اور بلند آہنگی کے

ساتھ سنائی دیتی ہے اس سے ان کے یہاں ایک طرح کی انفرادیت پیدا
ہوتی ہے عورت کے منھ سے اپنے جذبوں کا اظہار چونکانے والا بھی ہے اور
خاصہ نیا بھی۔'' (۳)

''بھیگی کالی رات کی بیٹی''، ''بدن دریدہ''، ''وصل کی کرن بن کر''، ''زبان کا بوسہ'' اور ''نذر فراق'' وغیرہ نظموں میں پہلی بار عورت کے حوالے سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ یہ احساس دلاتی ہے کہ عورتوں کے جذبات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن ''پتھر کی زبان'' اور ''بدن دریدہ'' کے برعکس ''دھوپ'' میں فہمیدہ ریاض کا لہجہ کچھ ٹھنڈا سا پڑ گیا ہے۔ اس کی تمام نظموں کا مواد خارجی دنیا سے لیا گیا ہے۔

سنگ دل رواجوں کے
خستہ حال زنداں میں
ایک صدائے مستانہ
ایک رقص رندانہ

یہ عمارت کہنہ ٹوٹ بھی تو سکتی ہے
یہ اسیر شہزادی چھوٹ بھی تو سکتی ہے
(ایک لڑکی سے)

کرودھ کپٹ سے بھرے بول
بول ہمارے بڑوں کے

اونچے اونچے کڑے بول
دھرتی کی ننگی چھاتی پر
ناچ رہے ہیں بڑے بول

(مہاجر)

''دھوپ'' میں فہمیدہ ریاض نے اپنے آباؤ اجداد کی زبان سے قریب تر ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس مجموعے میں ہندوستانی دھرتی کی مٹھاس اور رس ہے جس کی بنیاد ثقیل اردو الفاظ کے برخلاف عام بول چال کی زبان پر رکھی گئی ہے۔ اپنی شعری زبان کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فہمیدہ ریاض کہتی ہیں:

> ''دھوپ کی نظموں اور گیتوں کی زبان کٹھن ہیں پاکستان میں مروج قومی زبان سے ذرا مختلف ہے۔ کیونکہ اس میں عربی فارسی کی جگہ ہندوستانی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔''

اس طرح فہمیدہ ریاض کی آواز میں ایک للکار اور پکار ہے۔ وہ لشکر کی سالار بن کر چلنا چاہتی ہیں۔ ان کے کلام کو پڑھ کر ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فیض اور فراق سے بے حد متاثر ہیں۔ ان کا انقلابی انداز فیض کی یاددلاتا ہے اور بے باکانہ انداز ہندی الفاظ کی امیزش فراق کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اس طرح فہمیدہ ریاض کی شاعری میں باغیانہ پن اور بے باک پن دکھائی دیتا ہے۔ جو ان کی شاعری کو عروج پر لے جاتا ہے۔

حواشی

1۔ آزادی کے بعد اردو شاعرات، ڈاکٹر سلیم اختر، کلیات فہمیدہ، ریاض کا گردش پوش

2۔ میں مٹی کی مورت ہوں، نجمہ رحمانی

3۔ پاکستانی اردو ادب اور اہل، قلم خواتین، احمد پراچہ، ص 33

○

ساجدہ زیدی

ساجدہ زیدی کا نام بھی اردو شاعرات کے درمیان ایک نمایاں اہمیت کا حامل رہا ہے جن کی شاعری کی ابتدا 1975 میں ہوئی اور بقول قمر احسن:

''1960ء تک آتے آتے ہمارے علوم کے نظر اور تجربات کو بڑی وسعت ملی تھی اور زندگی اس کے حقائق، اس کے تجربے، اس کی دلداری، اس کی برکتیں اور اس کے المیے ہم پر اچانک پھٹ پڑے اور تمام گوشے اور امکانات جن پر ہم کسی وجہ سے اب تک غور نہ کر سکے تھے ہمارے سامنے متحرک تھے۔''(۱)

ایسے میں ان کی شاعری فطری طور پر ان وسعتوں، ان حقائق اور ان تجربوں سے اثرات قبول کرتی ہے۔ اور ان کی شاعری میں الفاظ ایک نئی شخصیت ایک نئے سیاق اور ایک نئے کشف سے دو چار ہوتے ہیں چنانچہ خود کہتی ہیں کہ:

''میرے ذہنی سفر کی ابتداء کب اور ارتقاء کیسے ہوئی؟ کسی قطعیت کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔ جو اقدار ورثے میں ملی تھیں ان کی شکست و ریخت کا تجربہ مجھے نو عمری ہی میں ہوا اس کے بعد سے اپنے اقدار کی خود تخلیق کرتی رہی۔۔۔۔۔۔۔۔ مذہب، مارکسزم، ہیومنزم، وجودیت ان میں سے ہر قدم ناگریز تھا۔ لیکن یقین اور وثوق سے مبرّا اور اسی لئے

دوسرے قدم کا پیش خیمہ بنا۔ ان میں سے ہر فلسفہ یا تو میرے تجربات
سے ابھرا یا ان میں مدغم ہوتا چلا گیا۔ یا دونوں کیفیتوں سے نا آشنا رہا۔
وجودیت کے فلسفے سے جب میں پہلی بار روشناس ہوئی تو ایسا لگا جیسے یہ
میرے ہی جذبہ وخیال تجربے ومشاہدے کی مربوط آواز ہے۔ جو میری ہی
طرح بے چین ذہنوں نے اٹھائی ہے۔ اس فلسفے کی جڑیں میں زندگی کے
بے شمار مظاہر میں پیوست عرصے سے دیکھ رہی تھی۔'' (۲)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ وجودیت کا فلسفہ ان کی شاعری کی اساس ہے اور اقدار کی شکست و ریخت، انسان کا اپنے وجود اپنے ماحول اپنے پیشے اپنے رشتے اپنی محبت اپنے جذبۂ عمل اور اپنے مستقبل ماضی سے دور ہو جانا اس کا موضوع ہے۔ وہ خود لکھتی ہیں:

''شاعری یا تخلیقی عمل کے محرکات بنیادی طور پر میرے نزدیک دو
ہیں۔ زندگی کے المئے کا احساس اور تصادم وکشمکش زندگی کے المئے کا احساس
خالص ذاتی سیاق وسباق میں بھی ہوسکتا ہے۔ اور کائناتی میں۔'' (۳)

اپنے شعری مجموعہ آتش سیال کا تعارف کراتے ہوئے ساجدہ زیدی نے اپنی شاعری کے محرکات اور موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ انہیں کس کس نے متاثر کیا اور ان کی ذہنی تعمیر میں کس کس نے حصہ لیا۔ اس ضمن میں انہوں نے سقراط، نطشے، ینگ اور سارتر، دستیوسکی اور چیخوف سے کامیو کافکا تک بہت سارا نام گنوایا ہے لیکن اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ اپنے اقدار کی تخلیق وہ خود کر رہی ہیں۔ اور ان کی شاعری ان کی ذات ان کی شخصیت کا آئینہ بن کر ظاہر ہوتی

ہے۔ اس آئینہ میں جو تصویر نظر آتی ہے وہ صرف ساجدہ زیدی کی اپنی نہیں بلکہ ہر اس شخص کا عکس ہے جو مادی زندگی کی بے بسی کا شکار ہے۔ زندگی کی بے معنویت کا پھیلتا ہوا احساس ان کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔

میرے چاروں طرف بیکراں اندھیرا ہے
میں لاکھوں سالوں سے ہوں غوطہ زن
تنہائیوں تاریکیوں کے ایک بے پایاں سمندر میں
یہ سارے فلسفے یہ آگہی اور فکر کے رشتے
یہ تہذیب و تمدن کے بلند آہنگ ہنگامے
مذاہب اور سیاست کی فسوں کاری
یہ سب مجذوب کی بڑ ہیں

(وجدان)

یہی جدیدیت کی فلسفیانہ اساس ہے۔ اور اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساجدہ زیدی ان شاعرات سے بالکل الگ ہیں جن کا ذکر پیچھے کیا جاچکا ہے۔ لیکن جس طرح ترقی پسند شعرا کے یہاں استحصال کے خلاف اُٹھنے والی آواز عورتوں کے استحصال کے خلاف اٹھنے والی آواز بن جاتی ہے۔ اسی طرح ساجدہ زیدی کے یہاں وجودیت عورت کے وجود کی شناخت کا وسیلہ بن کر ابھرتی دکھائی دیتی ہے:

میں خوشبو ہوں

میں نغمہ ہوں

میں معصوم ہونٹوں کی ہنسی ہوں

دل کی دھڑکن ہوں

اس کا درد ہوں

سوز مجسم ہوں

میں ہر زرہ میں دل بن کر دھڑکتی ہوں

(وجدان)

ایک عورت کے وجود کے مختلف روپ ان کی شاعری میں جابجا ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ جو شبنم سے زیادہ نرم اور شعلوں سے زیادہ گرم ہے۔

(1) ترے رخ کا شرر

گر خامشی کی

آہنی تاریکیوں کو چیر کر

چپکے سے آجائے

تو نبض کائنات آہستہ آہستہ چلتا آئے

دل امکاں دھڑک اٹھے

رخ دوراں سنور جائے

(2) چور دروازے سے دل کے
ایک شکل
روح میں چلی آئی
مقفل در دریچے کھل گئے

(3) یہ کس احساس کی سرگوشیاں ہیں
کہ لذت چند لمحوں کی بھی مل جائے تو اپنا لو
کسی کی مضطرب بانہوں میں کھو جاؤں
یہی لمحات کی راحت
مداوا ہے دل صد پارہ پارہ کا
یہی جسموں کی لذت
تشنگی کے دشت میں
ایک قطرۂ حاصل ہے شاید

(4) ادھر لذت جسم و جاں کی تمنا
ادھر خواہش جسم و جاں کے تقاضے
یہ بے تاب دھارا
جو دو ساحلوں کو ہم آغوش کرتا
ہمہ گیر کرتا

تشنگی کے دشت میں جسموں کی لذّت اکثر ایک قطرۂ حاصل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے میں اس کا اظہار براہ راست جنسی استعارات کی صوررت میں دکھائی دیتا ہے۔

تم مرے شوق کے مجروح بدن کو چھیڑو
میں تمہارے لئے احساس سے ہر لحہ بغل گیر ہوں
تم مری فکر کے پژمزدہ لبوں کو چومو
میں تمہاری نگہہ تشنہ کے زہراب کا جام
اپنی رگ رگ میں اتاروں کے بجھے پیاس کی آگ

لیکن رخ دوراں کو سنوارنے کی تمنا اور پیاس بجھنے کی آس دل ہی دل میں رہ جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے اس کی وجہ بھی عورت کی زبان سے سنئے:

مجھ کو اس رنگ میں گر دیکھا
تو گھبرا گئے کترا گئے جھلا گئے لوگ
میرے احساس کو افکار کو پھانسی دیدی
میرے ماتھے کی شکن نوچ لی
آنکھوں سے تمنا کی تڑپ لوٹ لی

(تصویر)

ایک عورت ہونے کی حیثیت سے عورت کے جذبات اس کے جذبۂ بغاوت

اس کی تشنہ آرزؤں کی تصویر اپنی اس نظم تصویر میں انہوں نے جس طرح پیش کی ہے۔
وہ قابل توجہ ہے۔ اسی طرح ان کی ایک اور نظم کہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ان کو بھلا اس سے کیا
میں نہ خاشاک ہوں اور نہ چٹان ہوں
صرف بہتا تڑپتا لرزتا ہوا
ایک احساس ہوں
اور ہر درد کا تازیانہ
مری زندگی ہے

آج بھی جب کہ مساوات کی بات کی جاتی ہے۔ نسائیت، تانیثیت اور Women Empowerment کی تحریکیں کارفرما ہیں۔ عورت کا وجود اپنی شناخت کے لئے برسرپیکار ہے۔ لیکن آج بھی صورتحال یہ ہے کہ:

دیکھنا ہو گر روح کا قتل
سخت دیواروں پہ آویزاں قطار اجسام
حسن نسواں کا خراج
اشتہاروں کے حرم میں دیکھو

ویسے ساجدہ زیدی کی شاعری دیگر مذکورہ شاعرات سے قدرے الگ نظر آتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں وجودیت کا فلسفہ گہرائی و گیرائی پیدا کرتا ہے۔

بہر حال ساجدہ زیدی عہد حاضر کی اہم ترین شاعرہ ہیں ان کا پہلا شعری مجموعہ 1962ء میں ''جوئے نغمہ'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ 1972ء میں ان کی نظموں کا ایک انتخاب ''آتش سیال'' کے نام سے بھی منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد لگا تار ان کا وجود خود کو تسلیم کراتا رہا ہے۔

○

حواشی

1۔ نیا اردو افسانہ چند مسائل، قمر احسن
2۔ آتش سیال، ساجدہ زیدی، ص 10
3۔ آتش سیال، ساجدہ زیدی، 12

پروین شاکر

پروین شاکر کی ہم عصر شاعرات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بنیادی طور پر نسائیت اور تانیثیت کا اظہار ان تمام شاعرات کا مرکزی موضوع رہا ہے۔ کہیں یہ اظہار ترقی پسند تحریک کے عدم مساوات کی صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے تو کہیں یہ حلقہ ارباب ذوق کے زیر اثر نفسیاتی گتھیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش بن کر ابھرتا ہے۔ اور فرد کے انفرادی شناخت کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اور کہیں یہ نفسیاتی مطالعہ فلسفیانہ صورت اختیار کر کے وجودیت کی آواز بن جاتی۔ ادا جعفری کے یہاں اجتماعیت ایک ایسی منزل کی جستجو بن کر ابھرتی ہے جہاں ہر انسان کو مساوی حقوق حاصل ہو مساوی حقوق کی یہ خواہش مرد وزن کے مساوات کے تصور کو بھی سامنے لاتی ہے۔ زہرہ نگاہ نے بھی جہاں آس پاس کے ماحول کو موضوع سخن بنایا اور اجتماعی مصائب اور سیاست کی گھات کو اپنی شاعری کے ذریعہ اجاگر کیا وہیں عشق کی واردات، عورت کے جذبات اور اس کی زندگی کے تلخ و شیریں لمحات کو بھی پیش کیا ہے۔ کشور ناہید کے یہاں عورت کے یہ جذبات ایک طوفان کی آمد کا پتہ دیتے ہیں۔ اور فہمیدہ ریاض کے یہاں یہ جذبات طوفان برپا کر دیتے ہیں یہاں تک کہ ان

پر فحش گوئی کا الزام عائد کیا گیا۔ دوسری طرف ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی نے وجودیت کے فلسفے میں وجود کی تلاش کو موضوع بنایا ہے لیکن ان سب کے درمیان پروین شاکر ایک ایسا نام ہے جس نے خاموش جذبوں کو قوت گویائی عطا کی خوشبو کو زبان عطا کیا کبھی حالِ دل سنایا تو کبھی دردِ دل بیان کیا منفرد لب و لہجہ کی اس متنوع شاعرہ نے نسائی جذبات کو سچائی اور اعتماد سے دلکش شعری پیکر عطا کیا۔ ان کی شاعری میں آپ بیتی کے خون جگر کی نمود اور جگ بیتی کی پرچھائیوں کا وجود یکجا ہو کر غضب کی اثر انگیزی پیدا کرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں خوش سلیقگی، آہنگ کا تنوع اور غزلیہ لہجے کی بازگشت ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ان کی نظمیں بھی ایک نفاست اور سلیقے سے مزین ہیں۔ پروین شاکر دراصل ایک خود آگاہ اور جہاں آگاہ شاعرہ ہیں جنہوں نے ایک نئے لہجے کی تشکیل کی ہے جس میں کلاسیکیت کا رچاؤ بھی ہے اور نسائیت بھی ہے۔

پروین شاکر کی شخصیت ان کی نظم نگاری، ان کی غزل گوئی کا تفصیلی مطالعہ پچھلے ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ وہ نئی نسل کی ممتاز شاعرہ تھیں۔ اور خوشگوار جدید تر لہجہ کی شاعرہ ہمیشہ زندہ رہیں گی بقول احمد پراچہ:

> ''انہوں نے شاعری کے وقار اور عورت کے دھیمے پن کو بحال رکھتے ہوئے شاعری میں نسائی جذبات و احساسات کو بڑی خوبصورتی سے شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ جذباتی کیفیت سے ایک فکری منزل کی طرف سفر کرتی ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری نے نوجوان ذہنوں کو بہت متاثر کیا اور

اپنے بے شمار مداح پیدا کیے۔"(۱)

(خوشبو/مطبوعہ نومبر 1977) تک ان کا سفر متنوع تجربوں اور سوچوں کی مختلف دیدہ و نادیدہ جہتوں اور حسن اظہار کے کتنے تیوروں سے آراستہ ہے۔ انہوں نے نظم اور غزل دونوں حوالوں سے بہت ہی عمدہ تخلیقات پیش کی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو "ایکسیٹی" "پہلے پہل"، "ورکنگ وومن" "بے پناہی" "تقیہ"،" سرشاری"،" مجھے مت بتانا"،" انہونی کی ایک دعا" اور ایک خط جیسی مختلف موضوعات پر اور نازک جذبات اور احساسات کی حامل نظمیں ہیں تو دوسری طرف غزلوں میں انہوں نے جس طرح خاموش جذبوں کو قوت گویائی عطا کی ہے اور اپنی نسوانیت اور نازک خیالی کو مجسم پیکر دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی غزلیں ان کی تخلیقی صلاحیتوں، انفرادی لب ولہجہ اور امتیازی اسلوب کی مظہر ہیں۔ پروین شاکر کی ہم عصر شاعرہ فہمیدہ ریاض کی رائے کے مطابق:

"پروین شاکر کے شعروں میں لوگ گیتوں کی سی گمبھیر سادگی اور لے بھی ہے اور کلاسیکی موسیقی کی نفاست اور نزاکت بھی۔"

"خوشبو" کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے عصری ادب کے خواتین نمبر میں شامل ایک مضمون میں نظیر صدیقی لکھتے ہیں کہ:

"غزلوں اور نظموں میں مساوی طور پر اتنی پرزور اور موثر شاعری بڑی مدت کے بعد دیکھنے میں آئی ہے۔ پر گوئی اور خوش گوئی کی ہم سفری کا

یہ عالم ہے کہ 254 صفحے کی کتاب میں کوئی حصہ ایسا نہیں جو دامن دل کو نہ کھینچتا ہو جس سے دامن کشاں گزر جانا آسان ہو۔" (۲)

بہر حال شفیق فاطمہ شعریٰ سے پروین شاکر تک کی شاعری کے مطالعے کے نتیجہ میں جو بات ہمارے سامنے آتی ہے اسے نجمہ رحمانی کے لفظوں میں ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ:

"ان شاعرات کے منفرد لب و لہجے اور ان کے پسندیدہ فکری تصورات سے قدرے ہم آمیز اور قدرے مختلف صورت حال پروین شاکر کے یہاں نمایاں نظر آتی ہے۔جن کی شاعری نے اس دہائی میں اپنا ایک ناگزیر مقام پیدا کیا ہے۔" (۳)

احمد پراچہ بھی خوشبو کے تعلق سے کچھ اس طرح کے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"خوشبو کے عنوان سے اپنا اولین شعری مجموعہ طبع کرا کے پروین شاکر نے جدید تر شعری فضاؤں میں خوشبوؤں کی لپٹیں بکھیر دیں اور پہلا تاثر ہی اس قدر بھرپور تھا کہ اس کا ذائقہ مدتوں تک موجود رہے گا۔" (۴)

"خوشبو" سے "کف آئینہ" تک پروین شاکر کی شاعری کا سفر محبتوں، چاہتوں اور والہانہ جذبوں کا سفر ہے جس میں کہیں حال دل سنائی دیتا ہے تو کہیں درد دل۔ ان کی نظم کے اس اقتباس پر یہ باب ختم کرتی ہوں جو ان کی شاعری پر صادق آتا ہے۔

زندگی کا حسن سارا
روح کی ساری نموں
عشق کا اعجاز ہے!
خار سے لے کر
رگ گل
اور رگ جاں سے دل جاناں تلک
نامیہ کی ایک ہی قوت پروئے کار ہے
عشق اور اس کا فسوں

○

حواشی

1۔ پاکستانی اردو ادب اور اہل قلم خواتین، احمد پراچہ، ص 66
2۔ عصری ادب کے خواتین نمبر، نظیر صدیقی
3۔ آزادی کے بعد اردو شاعرات، نجمہ رحمانی
4۔ پاکستانی اردو ادب اور اہل قلم خواتین، احمد پراچہ، ص 65

پروین شاکر کا شعری مجموعۂ کلام

(۱) خوشبو

(۲) صد برگ

(۳) خودکلامی

(۴) انکار

(۵) کفِ آئینہ (سب سے آخری مجموعہ)

Perween Shakir

FIKR-O-FUN

by

Dr. Farhat Yasmin
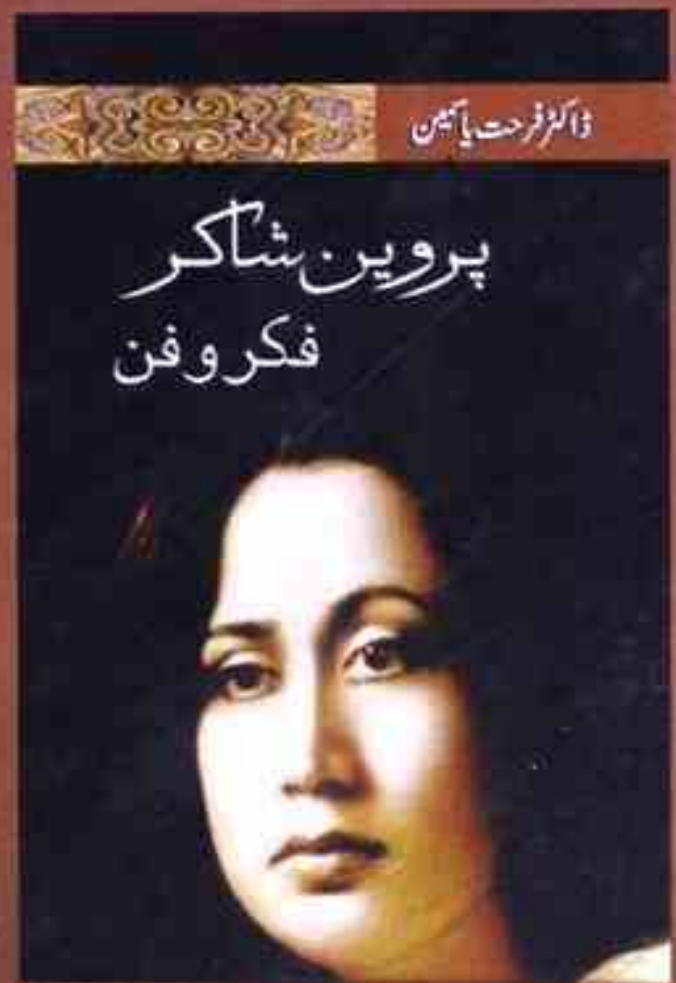
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com